چھوئی موئی

عصمت چغتائی

کہانی

پرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا...... پرانے زمانے میں بادشاہ ہی کو ہونے کا حق حاصل تھا۔ معلوم نہیں رعایا وغیرہ بھی ہوتی تھی یا نہیں۔ ضرور ہوتی ہوگی ورنہ وہ بیچارہ بادشاہ پھر کس کا ہو سکتا تھا اور اس بادشاہ کے یا تو سات لڑکے ہوتے تھے اور یا صرف ایک، یا سات لڑکیاں ہوتی تھیں یا ایک اور اس بادشاہ کے سب سے چھوٹے یا سب سے بڑے لڑکے کو کسی حسین ترین شاہزادی کی جوتی یا آنچل دیکھ کر عشق ہو جایا کرتا تھا اب ظاہر ہے کہ روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد غریب شاہزادہ عشق کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس کا باپ بھی اسی طرح عشق میں مبتلا رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا دادا اس کے باپ کا بھی کفیل ہوتا تھا اور یوں ہی یہ کاروبارِ عشق اور مفت خوری پشت ہا پشت سے چلی آرہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی شہزادے پر کوئی نہایت عجیب و غریب قسم کی مصیبت نازل ہو جایا کرتی تھی۔ وہ حور وش جس کے جوتے پر وہ ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو جایا کرتا۔ وہ حسینہ

اس کا بڑا ناک میں دم کرتی۔ نہایت ڈھٹائی سے اسے چڑیا کے دودھ اور بلی کے انڈوں کی قسم کے کوئی شے لانے کا حکم دے دیتی اور وہ بیچارہ بغیر چون وچرا گھوڑے پر بیٹھ کر چل کھڑا ہوتا۔ ایک دفعہ بھی تو اس احمق کے دل میں یہ خیال نہ آتا کہ یہ نیک بخت ان واہیات چیزوں کو منگا کر کیا کرے گی ؟ کیوں خواہ مخواہ حیران کر رہی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس ابلہانہ مہم پر جانے کے عوض ہم دونوں محبت میں وقت گزاریں۔ مگر نہیں یہ وہ کیسے کر سکتا تھا اس کا باپ تو اس سے بھی زیادہ بے معنی چیزیں لا چکا تھا اور دادا بھی۔ یہ اس کی آبائی حماقتیں شاید مجبور کر دیتی تھیں اُسے۔

اب یا تو وہ وزیر زادے کو ساتھ لے لیتا جو سائڈ ہیرو کی خدمت انجام دیتا اور اس کی کسی اور معشوقہ کی دوست یا وزیر زادی سے عشق لڑوانے کے کام میں لایا جاتا تھا یا کسی ضرورت سے زیادہ فرماں بردار خادم کو ساتھ لے جاتا جو موقع بہ موقع جاں نثاریاں دکھاتا رہتا۔

راستے میں اُسے قسم قسم کی معشوقائیں ملتیں، ان میں بعض تو چڑیلیں ہوتیں جو جادو سے عاشق صاحب کو سُور یا گھوڑا بنا دیتیں، اور بڑی مشکلوں سے وہ پھر انسان کے قالب میں آتا اور بعض مصیبت زدہ ہوتیں جنھیں وہ آزاد کر کے چھوڑ جاتا۔ واپسی پر انھیں مالِ غنیمت کی طرح سمیٹتا لاتا۔ جن اور اژدھے بھی ملتے جنھیں وہ جان سے مار کر یا غلام بنا کر منزلِ مقصود پر پہونچ جاتا اور چڑیا کا دودھ اور بلی کے انڈے قبضے میں کر کے پلٹ آتا۔

لیجئے شہزادی بھی کھٹاک سے شہزادے پر عاشق ہو جاتی۔ معلوم نہیں

شادی کے بعد وہ چڑیا کے دودھ اور بلی کے انڈوں سے کیا کام لیتی۔ ہمیں تو بس اس سے بحث ہے کہ جیسے خدا نے ان دونوں کے دن پھیرے، ہمارے تمھارے نہیں پھیرتا۔ دنیا بدل گئی ہے۔ آہ وہ حسین نورانی دُنیا ___ ستاروں سے میلوں آگے والی دنیا۔ اب کہاں؟ وہ کتابیں بھی تو اب کیڑے کھا گئے اور بادشاہ لوگ بھی کچھ ماند پڑ گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان بیچاروں کے کتنے لڑکے اور لڑکیاں ہیں اور انھیں عشق میں کیا کیا دکھ اٹھانا پڑتے ہیں۔ ہماری کہانیوں کے ہیرو کے پیر بہکے اور ایک سیڑھی نیچے پھسل آیا۔ بادشاہی لٹ گئی اور صرف نوابی رہ گئی۔ خیر جی باپ دادا کا دیا ہوا اتنا بھی باقی رہا کہ عشق بے فکری سے کیا جاسکے۔ شہزادیاں نہ رہیں تو ان کی جانشین طوائفیں تو اللہ رکھے موجود ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ طوائف کے مشاغل کو پیشہ کہتے ہیں اور نواب زادی کے پیشے کو روحانی ایک کو روپیہ کی ضرورت ہے، دوسری کو اللہ نے دیا ہے۔ لہٰذا امید ان ضرورت مند کے ہاتھ رہا۔ اب ان نئی معشوقاؤں کے انداز بھی وہی رہے۔ انھوں نے تو چڑیا کے دودھ اور بلی کے انڈوں سے بھی زیادہ ٹیڑھی فرمائشیں کیں۔ انھوں نے کو کن کو کان نہ سمجھ کر سنہری روپہلی نہریں سونت لیں۔ وہ تیشے چلائے کہ سوت پھوٹ نکلی اور پھر حضرت عاشق سوکھی گائے کی طرح تھان سے نکال دیے گئے۔

اور پھر دنیا کی قلابازیوں سے بدحواس ہو کر ہیرو زمیندار بنا۔ پھر لٹ گھسٹ کر سیدھا سادا انسان رہ گیا۔ لوٹ پوٹ کر جب یہ ہیرو شہزادے سے انسان بنا تو بھی اس نے وہ اپنا پرانا پیشہ نہ چھوڑا۔ سوائے عشق اور

دھندا ہی کچھ نہیں۔ کوئی کہانی کوئی قصہ جب تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہیرو کسی ہیروئن پر عاشق نہ ہو جائے۔ اگر وہ کلرک ہے تو مینیجر کی لڑکی کے موٹر کی خاک پھانکے۔ اگر طالب علم ہے تو پروفیسر کی لڑکی یا اور کسی طالبہ علم کا دُم چھلا بن جائے۔ مزدور ہے تو کسی سیٹھ کی بیٹی کی باگی جوتوں کا شکار ہو جائے اگر بے روزگار ہے تو کمپنیوں کے مالکوں کی لڑکیوں پر فدا ہو کر اپنی ساری ناکامی کا الزام ان کے سر تھوپ دے۔ اگر گاؤں سدھار کو جائے تو زمیندار کی لڑکی پر مر مٹے۔ ملک کی خدمت کو جائے تو چھانٹ کر دشمنانِ قوم کی لڑکیوں سے آنکھ لڑائے۔ غرض عاشق ہونے کا پکا انتظام ہو ورنہ وہ ہیرو نہ بن سکے گا۔ عشق چونکہ اندھا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھے کہ کہیں خدا نہ کرے عشق میں کامیابی آسانی سے نہ ہو جائے۔ عشق وہی زوردار ثابت ہوتا ہے جس میں معشوق کا عاشق کے گلے میں مستقل عذاب کی صورت میں لٹک جانے کا خدشہ نہ ہو ورنہ سارا عشق کر کرا ہو جائے گا۔ اگر محبوبہ دمے کی طرح دم کے ساتھ ہو جائے اور ہر سال ایک وبال کا اضافہ کرنے پر تل جائے تو سمجھ لیجئے ہیرویت کے گلے پر الٹی چھری پھر گئی۔ اگر خدا نہ کرے یہ مصیبت ٹوٹ پڑے تو واجب ہے کہ ہیرو پھر کسی ناممکن سی جگہ عشق کرے ایسی لڑکی سے جو کسی صورت سے بھی اس کی زندگی میں نہ کود سکے۔ وہ صرف عشق کرتا رہے اور یہی اُسے زیب دیتا ہے کیونکہ وہ ہیرو ہے اور ہیرو کے سینے میں دل ہوتا ہے۔ تو اس میں سوائے سودائے عشق اور کیا ٹھونسا جا سکتا ہے۔ یہ سارے لے دے عشق ہی کی تو ہے جس طرح دل کی شکل لمبوتری سے جو گھنٹی

نہیں ہو سکتی اسی طرح اس لمبوتری سی شے میں سوائے جنونِ الفت اور کچھ نہیں سما سکتا۔

اور جب ہیر و کہیں عشق کا کانٹا مارے تو لازم ہے کہ بس اسی کی دھن میں سینہ کوبی کرتا، سرد آہیں بھرتا قدم مارتا چلا جائے۔ اسے قطعی اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ پل بھر کو بھی سوچے کہ وہ کس دنیا میں رہتا ہے اور کیوں رہتا ہے۔ اُسے جو تنخواہ ملتی ہے وہ زندگی کے جملہ ٹیکس چکانے کے لئے کافی ہے یا نہیں اور کیوں؟ اُسے تو بس دنیا کا سب سے بڑا ظلم یہی نظر آتا ہے کہ اس کی منظورِ نظر وقت ضرورت اس کی آغوش میں نہیں آتی۔ وہ اگر کنواری ہے تو اس کا کوئی کٹکھنا سا رشتہ دار کنڈلی مارے اس کے گرد پہرہ دے رہا ہے۔ اگر شادی شدہ ہے تو اس کا نالائق اور ناکارہ، جی ہاں ناکارہ ہی ہوا کمبخت، شوہر وقت بے وقت آ ٹپکنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اور اگر آزاد پیشہ ہے تو کمبخت جسم کو بیچتی ہے مفت نہیں بانٹتی۔ بھاؤ تاؤ کرتی ہے۔ ندی نالے کی طرح ہر پیاسے کو سیراب نہیں کرتی اور اگر مفت لنگر بانٹنے کو تیار بھی ہو جائے تو گھر کی مالکہ طوفانِ بدتمیزی برپا کئے دیتی ہے۔ اگر گاؤں کی الھڑ چھوکری ہے تو کمبخت کے پیٹ میں بچہ رہ جاتا ہے جسے سماج بن بلایا مہمان یا بنا پرمٹ کا غیر ملکی سمجھتی ہے۔ ایک مصیبت ہو تو کوئی بھگتے۔ اس سے تو کہیں سیدھے بیچارے پرانے زمانے کے دیو بھوت ہوتے تھے کہ ہیرو مزے سے پیٹ کے ہاتھ دکھاتا انھیں پھونکوں سے اڑاتا چلا جاتا تھا۔ لیکن یہ آج کل کی مصیبتیں تو بس ہر قدم پر اڑنگا لگاتی ہیں۔

اب رہی ہیروئن۔ تو یہ وہی پرانے زمانے کے ایک بادشاہ کی کوئی سی لڑکی ہونی چاہیئے۔ وہی جو اپنے عاشقوں کو متوجہ کرنے کے لئے جوتیاں اچھالا کرتی تھی۔ اس شاہزادی کا خوبصورت ہونا، اور جو کمبخت کانی کھڑی ہوئی تو شہزادہ اسے جوتے سے کھال اُدھیڑ کر چلتا بنے گا، وہ بھی شہزادے کو جھڑی جھڑکے سے دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی تھی۔ خود بے طرح عاشق ہوکر بھی وہ ظالم عاشق کو تگنی کا ناچ نچا کر ہی قبولتی تھی۔ ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو بہانے کے علاوہ اُسے کچھ اور دوسری نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یہ معشوق کا کردار تو بس آسانی سے نباہا جاسکتا ہے۔ ذرا آنچل لہرا دینا۔ آنکھوں سے از قسم تیر و تفنگ برسا دینا یا پھیل پھیل کر انگڑائیاں لینا، سینے پر سے دوپٹہ پھسلا دینا اور دو چار کا آمد لٹکے، بس کافی ہے۔ جب شہزادے کا راج پاٹ چھنا تو شہزادی بھی دنیا میں پھسل آئی، مگر حسن کی بجلیاں برابر کوندتی رہیں۔ زندگی کے ہر موڑ، ہر نکڑ پر وہ اپنی رعنائیوں کا پٹارہ لئے تاک میں کھڑی رہتی ہے کہ ہر آنے جانے والے پر وے مار دے اور پھر جب دونوں طرف برابر آگ لگ جاتی ہے، مصائب اپنے پھن اٹھاتے ہیں۔ پہلے تو اس کے باپ بھائی ہی پہرہ دیتے ہیں۔ پھر یا تو اس کے عاشق کا رقیب اسے بیاہ لے جاتا ہے اور عاشق مڑ مڑ کر دیکھتا رہ جاتا ہے یا کافی بھاگم بھاگ کے بعد عاشق ہی کامیاب ہوجاتا ہے۔ اول الذکر حالات میں عشق خوب پروان چڑھتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا والی بات رہتی ہے اور آخر الذکر حالت میں ہیرو ہیروئن وہاں چلے جاتے ہیں جہاں سے کوئی بھی خبر نہیں آتی یعنی گھر گرہستی کے چکر میں سب

داؤ پیچ ختم ہو جاتے ہیں۔

ہیروئن کے لئے لازمی ہے کہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو اور شادی کرتے وقت وہ سماج اور والدین کے سر سارا الزام منڈھ دے۔

ہیروئن کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ کیونکہ تعلیم پا کر وہ نہایت خرانٹ ہو جاتی ہے۔ وہ لٹکے بھی کچھ بھول بھال جاتی ہے عین موقع پر شرما کر نیچی نظروں سے تیر برسانے میں قطعی فیل، آنچل ڈھلکا کر سینے کا ابھار دکھانے کا رتی بھر سلیقہ نہیں۔ نہایت کھری اور ننگی ہوتی ہے اور جو کوئی ذرا جاندار ہوتی ہے تو وہ سخت بدمعاش ہوتی ہے۔ بالکل طوائف کی سی باتیں اور وہ ہتھکنڈے، یقین نہ آئے تو فلم کمپنیوں کے ڈائرکٹروں سے پوچھئے۔ وہ آپ کو بتا دیں گے کہ تعلیم یافتہ لڑکی ہیروئن ہو ہی نہیں سکتی وہ کچھ ہو سکتی ہے تو وہی جو ایک ڈائن ہو سکتی ہے۔ ہیروئن کو صرف اتنا پڑھانا چاہیئے کہ وہ عاشقانہ خط لکھ اور محبت نامے پڑھ سکے۔

لیکن سب سے زیادہ کارآمد ہیروئن وہ ہے جو آپ کو گاؤں میں ملتی ہے۔ نہایت الھڑ۔ آسانی کے لئے چولی چھوٹی اور لہنگا بسرے لگا مفت میں ہاتھ آجائے گا۔ اب وہ خواہ تیر نظر برسائے یا نہ برسائے سچی محبت کھٹ سے ہو جائے گی۔ اس کے باپ بھائی بھی مزید آسانی بہم پہونچانے کو ہل میں جتے رہتے ہیں۔ لہذا بڑے آرام سے ہمارا ہیرو ندی کے کنارے جا سکتا ہے۔ وہاں ہیروئن بکریاں چراتی مل ہی جائے گی۔ ہیروئن کو بکریاں ہی چرانا چاہیئے۔ عشق بازی کے لئے میدان اچھا ملتا ہے۔ مرنے سے ادھر

بکریاں چر رہی ہیں۔ اِدھر عشق چل رہا ہے۔ اب ہیرو چاہے تو اس جنگلی دوشیزہ کی تصویر تارنا شروع کردے یا اور کوئی اُس قسم کا بہانہ تراش لے۔ پیاس لے سر میں پتھر دھڑ لگالے یا اگر بہت زیادہ حقیقت پسند ہے تو دریا میں ڈوبتے ڈوبتے بچ جائے۔ بچنا اشد ضروری ہے ورنہ کہانی کی ابتدا المیہ ہو جائے گی ظاہر ہے کہ ہیروئن متوجہ ہوگی اور اس کا سر زانو پر رکھے گی۔ اس وقت وہ ہوش میں اگر اس پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ یا جب وہ اپنے دوپٹے کو پھاڑ کر زخم پر پٹی باندھے تو دوپٹے کی غلاظت سے سپٹا کر ہونے کے خوف کو دبا کر اس کا ہاتھ واتھ پکڑلے اور پھر یقیناً اسے چرواہی کے سفید کبوتریوں کے سے پیر مومی انگلیاں اور گھنی پلکوں کے دراز سایے، بازوں کی گولائی پر غور و خوض کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اتنا واضح رہے کہ بھولی بھالی گاؤں کی دوشیزہ تو آپ کو ہندستان میں بھیڑ بکریوں کی طرح مل جائے گی۔ مگر بھول کر بھی بنگال کی طرف رُخ نہ کیجئے گا وہاں کی دوشیزہ تو کال کی بھنبھوڑی چچوڑی ہڈی رہ گئی ہے۔ دکھن کی طرف بھی نہ جایئے گا کیونکہ اناج کی مہنگائی نے وہاں کی دوشیزہ کو بھی چوس ڈالا ہے گجرات مہاراشٹر کی مچھیرن کے پاس بھی اس وقت عشق بازی کے لئے وقت نہیں ہے کیونکہ وہاں بھی غذا کی کمی نے اُسے مکا کی روکھی روٹی کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ تیل کی مہنگائی کی وجہ سے اس کے بال اب ناگوں کی طرح پھنکاریں نہیں مارتے۔ اس کی پھٹی چولی کے سوراخ میں سے بکھن میں گندھی ہوئی لوئی کے عوض خارش زدہ ٹھٹھرے ہوئے لتھڑے نظر آتے ہیں۔ پنجاب سے بھی

آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ جو کچھ تھا وہ گلیوں سڑکوں پر چیل کوّے اور گِدھ کھا گئے کشمیر، جہاں زعفران کے ہر ریشے کے ساتھ دوشیزائیں چلی آتی ہیں، آپ انھیں چشموں کے کنارے حسن و عشق کی آنکھ مچولیاں کھیلنے کی فرصت نہیں، وہ تو عشق سے کہیں اونچی کہیں زیادہ دلچسپ اور رنگین مقصد کے پیچھے دوڑ رہی ہیں اب انھیں آلوچے کے جھنڈ میں آنکھیں مارنے کی فرصت نہیں، کیونکہ نظروں کے تیرِ نیم کش کے عوض ہاتھوں میں رائفل اور لاٹھیاں ہیں ہیرو سے کہہ دیجیے۔ ذرا سنبھل کے، یہ میدانِ عشق نہیں میدانِ جنگ ہے۔

زندگی ہے کہ طوفان بے تمیزی۔ کوئی کیا کہانی لکھے؟ ہیرو منھ پھلائے بیٹھا ہے۔ آہیں بھر بھر کے اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول گیا ہو کیونکہ پیٹ کا تنور ٹھنڈا پڑا ہے۔ عشق تو دُم دبا کر بھاگ چکا ہے اور زندگی نیم بسمل کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ دمشق میں بھی ایسا کال پڑا تھا کہ عاشق و معشوق چوکڑی بھول گئے تھے۔ تو کیا ہندستان کا جذبۂ عشق اس خون کی برسات سے دُھندلا بھی نہیں پڑا ہوگا۔ ضرور پڑی ہوگی اوس۔ جبھی تو ہیرو ایسا سنگدل ہوگیا ہے کہ لاٹھی چارج اور تنگی نے تیرِ نظر سے گھائل ہونے کی سکت ہی نہیں چھوڑی ہے، وہ اکتایا ہوا کہہ رہا ہے۔ اے دوشیزہ تمھارے ڈھلکتے آنچل میری زندگی کو روندتی ہوئی چاپوں سے نہیں ہٹا سکتے مجھے شرابِ الفت پلانے کی بجائے اصلی دودھ کی دو گرم گرم چائے کی پیالیاں پلا دو تو بڑا کرم ہو۔ تمھارے الجھے ہوئے خشک بال سن کی رسیوں کی طرح میرے ننگے جسم میں چبھ رہے ہیں۔ انھیں سمیٹ لو۔ اس وقت

تک انھیں پریشان نہ کرنا۔ جب تک کہ یہ نیل چھلیں سے ٹھک نہ اٹھیں۔ نازو نخرے کم کرو۔ ہاتھوں کی مہندی چھٹا کر ذرا اس لڑھکتی ہوئی چٹان کو سہارا دو۔

ہیروئن الگ بال بکھرائے ٹسوے بہا رہی ہے۔ بہت دن تک تم میرے حسن کے جھوٹے گیتوں سے اپنے ہونٹوں کو آلودہ کرتے رہے اب میرے کان پک گئے۔ سنتے سنتے تمھاری بکواس۔ تم جھوٹے ہو۔ تمھارا فلسفہ جھوٹا۔ میرے ہونٹ جنھیں تم گل برگ تر کہتے ہو۔ کانٹوں سے بھی زیادہ خشک ہیں۔ میں نے آج تک کسی پر نین بان نہیں چلائے۔ کیونکہ میری آنکھیں تو بچپن ہی میں دکھ دکھ کر چندھیا چکی ہیں اور پلکیں پڑبال سے جھڑ چکی ہیں۔ میری پھٹی چولی میں سے جھلکتے ہوئے نیم مردہ گوشت کو دیکھ کر ذہنی چٹخارے نہ لو۔ اس میں کھجلی اور جوؤں نے گھاؤ ڈال دیے ہیں کہاں ہیں گدر انار اور پکے امرود۔ تین دن سے ننھا بھوک سے بل بلا رہا ہے۔ نہ گاؤ میری عصمت اور تقدس کے نغمے کہ میں سڑک کے بیچوں بیچ دلھن بن چکی ہوں۔ مجھے عشق و محبّت کی گھات میں جھڑکوں میں نہ نبھاؤ میرے ہاتھ میں بیلچہ دے دو۔ ایک ہاتھ سے میں ننھے کا پنگوڑا جھلاؤں گی اور دوسرے سے دھان کوٹوں گی۔ پھر بھی میرے لب تمھارے بوسوں کے لئے خالی رہیں گے۔ اس فکر میں کیوں گھلے جاتے ہو۔ ذرا ایک بار حسن و عشق کے بوسیدہ بستر سے اٹھا کر مجھے اپنے پاس کھڑا تو کر لو پھر دیکھنا۔ پھر بھی اگر آپ کو میرا یقین نہیں آتا تو کرشن سے پوچھئے کہ کیوں اس کی چمپا کلی سے

زیادہ نازک اور مہکتی دوشیزہ "پشاور میل" بن کر وندنانے لگی۔ اور کیوں اس کا مرگلا، روتا بسورتا مجنوں" تین غنڈے" بن بیٹھا"۔ اور کیوں اس کے" نظارے "پکار پکار کر کہتے ہیں کہ "ہم وحشی ہیں" عباس سے پوچھئے وہ بتادے گا کہ کیوں اس کی ایک لڑکی "کی رعنائیاں "اجنتا" کی بے جان چٹانوں میں منجمد ہوکر رہ گئیں، سردار جعفری سے پوچھئے کہ کیوں اس کا سر نئی دنیا کے سلام کو بے ساختہ جھک گیا۔

اور کیوں ہر قلم خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کیوں کاغذ کا پرزہ پرزہ فرطِ الم سے لرزاں ہے۔ ہر اخبار اور رسالے کے سینے میں شعلے کیوں لپک رہے ہیں اور کیوں ہر کتاب کے صفحوں میں چنگاریاں دبی دبی سلگ رہی ہیں۔

انسانیت شیطانیت سے پٹ کر رو رہی ہے۔ حسن و عشق ایک دوسرے کی موت پر گلے مل مل کر ماتم کر رہے ہیں۔

تو میں کیسے کہانی لکھوں؟ کہانی کے لئے مسالہ کہاں؟

فسادات اور ادب

فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ قدریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں۔ گورنمنٹ کے افسر، دفتروں کے کلرک مع میز کرسی قلم دوات اور رجسٹروں کے مالِ غنیمت کی طرح بانٹ دیے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے دستِ شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے ان کے دلوں کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایک بھائی ہندستان کے حصے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ ماں ہندستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندستان میں تو بیوی پاکستان میں۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے، یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چل دی۔

فسادات اور آزادی کچھ اس طرح گڈمڈ ہو کر وارد ہوئے کہ یہ قیاس لگانا

دشوار ہو گیا کہ کون سی آزادی ہے اور کون سا فساد۔ لہذا جس کے حصے میں آزادی آئی فساد آگے پیچھے لائی۔ ایک بار ہی طوفان کچھ اس طرح بے کہے سُنے وارد ہوا کہ لوگ بستر بوریہ بھی نہ سمیٹ سکے۔ پر جب ذرا ٹھنڈک پڑی تو جلد حواس جمع کر کے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔

جب زندگی کا کونہ کونہ اس بھونچال کی عنایت سے تلپٹ ہو چکا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ شاعر اور ادیب الگ تھلگ بیٹھے رہتے، جب زندگی خون میں غلطاں ہو گئی تو پھر ادب جس کا زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے کہاں تک تردامنی سے بچ سکتا تھا، لہذا ہجر و وصال کے جھگڑے بھول بھال کر لوگ ہڈی پسلی کے بچاؤ کی فکر میں پڑ گئے۔ شیطان کے چیلوں کے انداز دو چار ہاتھ انداز معشوقانہ سے بھی آگے نکل گئے۔ پناہ گزینوں کے قافلوں نے قیس و فرہاد کی صحرا نوردی پر خاک ڈال دی یہاں تک کہ غزل بھی جسے جاگیرداری کی نازپروردہ کہا جاتا ہے چوکڑی بھول کر کوچۂ جاناں سے نکل بھاگی اور جلے ہوئے بازاروں، لٹے ہوئے مکانوں اور کچلی ہوئی انسانیت کے انباروں میں بھٹکنے لگی۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ آخر غمِ جاناں کو ایک دن بڑھ کر غمِ دوراں ہونا تھا۔"

جوں ہی ادیبوں اور شاعروں کے ہوش و حواس درست ہوئے اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں مختلف خیالات اور جذبات کے حامی نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند بھی اور رجعت پسند بھی اور وہ بھی جو نہ ترقی پسند ہیں نہ رجعت پسند۔ درمیان کا کوئی معمہ۔ کچھ تو ان میں ایسے تھے جو گارا مٹی اور چونا لیکر فوراً لیپ پوت پر ڈٹ گئے۔

نئی دیواریں پھر سے اٹھائیں، ٹپکتی چھتوں پر مٹی ڈالی، مسمار ایوانوں کو نئے سرے سے سمیٹا۔ یہ ہوئے وہ جن کی تخلیقات کا مقصد تعمیری تھا۔۔۔ اس صف میں پیش پیش وہی نظر آتے ہیں جنھوں نے بدیسی راج کے سایے میں جنم لیا تھا مگر اس سایہ سے عرصہ ہوا اکتا چکے تھے، جو اس بدیسی حکومت کے ہاتھوں نالاں اس کے جانے کی راہ دیکھ رہے تھے اور جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ سفید چمڑی والے لٹیرے ہندستان سے چلے گئے، وہ ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے آزادی کے نشے نے انھیں ایسا مدہوش کر دیا کہ وہ سڑکوں پر ناچنے گاتے، کودتے، اچھلتے ذرا بھی تو نہ جھینپتے، ذرا بھی تو نہ شرماتے۔ اور شرمانے کی فرصت کسے تھی۔ یونین جیک نیچے پھسل رہا تھا، ترنگا اونچا ہو رہا تھا۔ اور وطن پرستوں کے دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ گئے۔ سینما میں جیسے چونّی والے، ہیرو کو گھوڑے پر آتا دیکھ کر سیٹیاں بجا بجا کر ناچتے ہیں، بالکل اسی طرح یہ نشہ آزادی کے متوالے ترنگے ہیرو کو عرش پر چڑھتا دیکھ کر گلی گلی کوچے کوچے ناچنے تھرکنے لگے۔

"جھوم جھوم کر ناچو آج گاؤ من کے گیت" پریم دھون نے گایا۔

"بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے" جوش صاحب گرجے۔

"بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج۔ ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے"

جذبی نے بیتاب ہو کر کہا۔

"اے رود گنگا گیت گا | اٹھلا کے چل موجِ چمن
ہاں اے ہمالہ جھوم جا | رقصاں ہو اے کوہ و دمن
ہاں اے اجنتا کے بتو | نغمہ سرا ہو، نغمہ زن

آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے ہندوستاں۔" جاں نثار اختر نے جھوم کر کہا۔

میری دِلّی، میری محبوب دِلّی
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خود کام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے۔
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے۔
تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے خوابوں کی تعبیر ہے۔
آرزوؤں کی تصویر ہے۔
تیرے چہرے پہ میں آج اک نُور سا دیکھتا ہوں .... جعفری نے للکارا۔

لیکن ۱۵ اگست بھی آیا تو ٹھہرنے کے لئے نہیں جانے کے لئے اور اپنے پیچھے کھسیائے، رد ملے نسے اور منہ بسورتے ہوئے انسانوں کا سیلاب چھوڑ گیا۔ گاتے دل خاموش ہو گئے۔ ناچتے پیر تھم گئے، جو رقصاں بھی رہے۔ وہ نہ جانے کس تال سر کے بل بوتے پر جلے ہوئے دل سوچنے لگے اور یہ سمجھنے لگے۔ معلوم ہوا یار لوگ ہنی کا چاند کپڑا کر چل دیے جس کا لمحہ اتنا کچا تھا کہ وہ دن نہ ٹھہر سکا۔ جیسے صبح صادق جانا وہ صرف ایک بیٹا نہ تھا جس کی عارضی روشنی میں بھولے دل ایک دم جھوم اُٹھے تھے۔ جانے والے کس چالاکی سے گئے کہ جسم لے گئے روح چھوڑ گئے اور ستم ظریفی دیکھیے کہ آزادی کے دو ٹکڑے کر کے پکڑا گئے۔ کہنے کو کہہ دیا کہ ہندستان ہندستانیوں کو پاکستان پاکستانیوں کو دے گئے۔ جب حساب کتاب گیا تو یہ پتہ

چلا جو کچھ ملا ہندستان کے سرمایہ داروں اور پاکستان کے جاگیرداروں کو ملا جو ہاتھ پہلے خالی تھے، وہ اب بھی خالی ہیں۔ اندھے نے بانٹیں ریوڑیاں، اپنوں ہی کو دیتا چلا گیا۔ چنانچہ جوش صاحب بپھر کر بولے

"یہ بیونت یہ کتر۔ یہ کانٹ چھانٹ ابتری
شناوروں کی ڈبکیاں، مجاہدوں کی بے پری
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے"

اور سردار جعفری نے دانت پیس کر کہا:۔

"کون آزاد ہوا ؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ؟
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اُداسی ہے وہی
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لئے "

اور مجاز نے چپکے سے کہا:۔

"یہ سب خون میں ہاتھ ہیں جن کے تر
یہی تھے مسیحا، یہی تھے خضر "

ادھر سے احمد ندیم قاسمی نے اطلاع دی کہ یہاں بھی خیریت نہیں

"روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں ٭ عصمتوں کی سجی دوکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے ٭ خون کا ذائقہ زبانوں پر "

اور مجروح نے چڑھ کر کہا :-

"اب وہ غمِ زنداں دیتے ہیں جن کو غمِ زنداں ہونا تھا۔"

اور اختر نے لبھو رکر کہا :-

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن

مگر انھیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ....۔

ہاتھ لگتے ہی تو رنگِ گلِ تر چھوٹ گیا

ہار گندھنے بھی نہ پایا تھا، ابھی ٹوٹ گیا

جام لب تک بھی نہ آیا تھا، ابھی چھوٹ گیا

میرے خوابوں کو نہیں کوئی مجھے لوٹ گیا

غرض ہر طرف سے لے دے شروع ہوگئی لیکن اس سے قبل کہ جواب دہی کی طلب زور پکڑے ایک دم سے فسادات کا دھاوا پوری طاقت سے سر پر چھوڑ دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ حقوق کی طلبی سے دھیان ہٹا کر پہلے فسادات کی روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہندستان، اور پاکستان کے بیشتر ترقی پسند ادیب فوراً اس طرف متوجہ ہوگئے اور دوسرے ترقی پسند عناصر کی ہمراہی میں کام شروع کر دیا گیا۔ چاقو اور چھری کا وار قلم پر روکا گیا۔ گو رجعت پسندوں نے چاقو چھری ہی کا ساتھ دیا مگر فتح ترقی پسند عناصر کی ہوئی۔ یہ ایسا وقت تھا جب جان کی قیمت ایک مٹھی ریت ہوگئی تھی۔ شرنارتھیوں کی بیکس فوج کو نہتا میدان میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہر مطالبے کے جواب میں فساد کی آگ دونی بھڑکا دی جاتی تھی۔ کرتا دھرتا بیٹھ موٹے کھڑے تھے۔ مصلح قوم نہ جانے کہاں اونگھ رہے تھے۔ اس وقت

ادیبوں نے بالکل اسلحہ جات کی طرح ڈرامے، اسکیچز اور نظمیں تیار کر کے تیزی سے فضا میں بکھیر دیں۔ احمد عباس نے اپنا ڈرامہ "میں کون ہوں؟" ڈیڑھ گھنٹے میں بیٹھ کر گھسیٹ ڈالا، ریہرسل کیا اور اسی شام شہر کے کئی حصوں میں اسے پھیلا دیا گیا۔ اس وقت عباس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ اس جلد بازی سے فن کو ٹھیس نہ لگ جائے، اس کے قلم کی متانت نہ ہو جائے، ایک ادیب کی عظمت میں فرق نہ آجائے۔ اور اگر وہ یہ سب کچھ سوچ لیتے تو شاید "میں کون ہوں؟" کو فن کا بہت کچھ مرقع بنا لیتے۔ مگر وہ اس آگ کے لئے چھینٹا نہ بن سکتا جو اس وقت بھڑک رہی تھی، اس بھڑکتی ہوئی دنیا کو شہ پاروں سے زیادہ چھینٹوں کی ضرورت ہے۔

اسی زمانے میں کرشن چندر نے باقاعدہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر کے افسانوں، کہانیوں، اور اسکیچز کی ایک فوج کی فوج میدان میں اُتار دی۔ جس تیزی سے فساد پھیلے اسی تیزی سے کرشن کے افسانے ہندستان اور پاکستان کے رسالوں کے ذریعے پھیل گئے۔ قصداً یا شاید انجانے طور پر یہ بمباری کچھ اس انداز سے کی گئی کہ دنیا میں کہیں اور ایسی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی، کہ ایک ہی ادیب نے دوا کی خوراکوں کی طرح اس مختصر سے عرصے میں اتنا کچھ لکھا ہو اور نسخہ مفید ثابت ہوا ہو
کرشن نے جو کچھ لکھا جذبات کی رو سے بچ کر سمجھ بوجھ کر اور شاید زبردستی لکھا، آمد کا گلا گھونٹ کر آورد کو لبیک کہا۔ وہی لکھا جو اس نے لکھنا چاہا۔ جو مصلحتِ وقت نے کہا۔

یہ وہ وقت تھا جب دونوں فرقے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے

تھے۔ ابھی گنتی تو ہوئی نہیں جو یہ پتہ چلے کہ کس پارٹی نے زیادہ شکار کئے۔ اگر مسلمانوں نے دو ہزار برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے تو ہندوؤں نے چار ہزار۔

مسلمانوں نے چھ ہزار

ہندوؤں نے آٹھ ہزار ۔ ـــــــ آٹھ ہزار ۔ سولہ ہزار، بتیس ہزار سو ہزار۔ اب کوئی نیک بخت عقلمند ہوتا تو گن کر بتا دیتا کہ جیت کس پارٹی کے سورماؤں کو نصیب ہوئی؟ ویسے تو ہر جیتا ہوا شکست خوردہ سے بدتر نظر آتا ہے۔ سب ہی کے سر ندامت سے جھکے ہوئے ہیں ایسی حالت میں جو کچھ کرشن چندر احمد عباس، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، اشک، ساحر لدھیانوی، ہاجرہ مسرور اور اسی برادری کے دوسرے لکھنے والوں نے لکھا۔ اسے عزیز احمد، حسن عسکری اور ایم۔ اسلم ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے ترازو میں تول تول کر ہر وحشی کو برابر کا حصہ دیا ہے۔ حالانکہ ان کا خیال ہے کہ ظلم صرف ہندوؤں اور سکھوں نے کئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کس بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ شاید ظالموں نے حساب کتاب کا رجسٹر ان کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔ ورنہ ہر عقل رکھنے والا اندازہ سے ہی کہہ سکتا ہے کہ ظلم دونوں فرقوں نے کئے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کئے۔ ان کی رائے میں یک طرفہ تصویر ہی صحیح حالات کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کو بھی وہی کچھ لکھنا چاہیئے تھا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو کیا ہوتا۔ اس زمانے میں جب کرشن نے یہ افسانے لکھے۔ اس کا گھر شرنارتھی کیمپ بنا ہوا تھا۔ مغربی پنجاب کے لٹے لٹائے

ذہنی اور جسمانی زخمی اور ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کون جانے کرشن کے دل میں مسلمانوں کے خلاف کتنا شدید جذبہ اٹھا ہوگا۔ کسے معلوم ان خانہ برباد عزیزوں اور پیاروں یں بیٹھ کر اس کی حقیقت بین آنکھوں پر کتنی اندھیری چادر پڑ گئی ہوگی۔ مگر وہ کونسا جذبہ اور کون سی طاقت تھی جس کی مدد سے اس نے اس چادر کو چاک کر کے باہر جھانکا۔ کئی بار یہ محسوس کر کے کہ وہ متعصب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس فضا سے بھاگ نکلا ہوگا تاکہ ان دکھیوں کی آہوں کی گرمی سے دور ہٹ کر تصویر کے دوسرے رخ کو اپنی تخئیل کی نگاہ سے جنم دے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی تصویریں چنیں یا تخلیق کیں جن کی نمائش کے وقت ترازو سے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ اور اس وقت ہر شخص جسے اپنے ملک سے پیار تھا۔ یہی کرتا جو کرشن نے کیا ترازو اٹھا کر ایک پلڑے میں چشم دید واقعات اور بیتے ہوئے حالات رکھے دوسرے میں تخیل کے کھینچے ہوئے نقشے۔ کوئی اور ہوتا تو ڈنڈی مار جاتا۔ یا ایم۔ اسلم کی طرح ایک ہی پلڑے کی ترازو لیتا۔ یا بقول عسکری صاحب نہ ظالم کو ظالم کہتا۔ نہ ظلم کی مذمت کرتا۔ نہ بدی کو روکنا پسند کرتا اور چند احمقانہ لطیفے لکھ کر اسی انتظار میں بیٹھ جاتا کہ انسان کی نیکی جو بدی کے ساتھ ضرور ہوتی ہے کب تہ سے اچھلے اور سطح پر آئے اور پھر اسے غیر فانی تخلیقی ادب کا رتبہ دے کر خراج تحسین کی امید کرتا میرے خیال میں خواہ کرشن چندر نے ادب کا گلا گھونٹا، فن کی نزاکتوں کو کچلا، مصنوعی ادب کو جنم دیا مگر وہ اپنے فرض سے غافل نہیں رہا۔ اس نے پروپگینڈا کیا اور مصلح بن بیٹھا۔ اس وقت جبکہ ہمیں فنکار سے زیادہ رہنما کی ضرورت تھی اس نے وہی کیا جس کی ضرورت تھی، مصلحت تھی۔ حسن عسکری کی نظروں میں مصلح

احمق ہوں گے چونکہ وہ خود مصلح بننے کی کوشش میں یہ سب کچھ ثابت کئے دے رہے ہیں۔ ہمیں حسن عسکری کی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں ہمارے سامنے اَن مِٹ قدریں موجود ہیں۔ ہم انھیں پر نظر رکھیں گے۔

باوجود ان سب باتوں کے کرشن چندر اور دوسرے کئی لکھنے والوں نے جو کچھ بھی فسادات کے بارے میں لکھا وہ ادبی نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی پہنچا نہیں "ہم وحشی ہیں" کا طرز بیان، پلاٹ اور پرواز تخیل کے معاملہ میں خود کرشن کے گزشتہ مجموعوں پر بھاری ہے، وہ سوز وگداز وہ چبھن جو "یہاں کے نظاروں" میں نہ تھی "شکست" میں بھی نہ تھی غرض سوائے "ان داتا" کے کہیں بھی نہ تھی۔ حال ہی میں جو کرشن کی تحریروں میں آتش فشانی صنعت پیدا ہوئی ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ ان تحریروں میں ایک لگن ہے، ایک مقصد ہے، ایک ارادہ ہے اور اس کی تکمیل ہے۔ اور یہی چیز ہے جس نے اسے اتنے بلند مرتبے پر پہونچا دیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو سینہ کوٹ کوٹ کر فرقہ وارانہ ماتم کر رہے ہیں اور اپنی اس حرکت سے فسطائی طاقتوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ یہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے پٹھو عوام دشمن اور موقع پرست ہیں۔ ملک کے بٹوارے کے وقت جو مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا ہے اس کی حفاظت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ملک کے ٹکڑے ہوتے وقت جو کچھ ان کے ہاتھ لگا وہ عوام شاید ان کے حلق سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فرقہ وارانہ ڈھونگ رچا کر ان کا دھیان بٹانا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزوں کے تربیت دیے ہوئے ان کے جانشین

ہیں جب کبھی ہندوستانیوں نے آزاد ہونے کی خواہش ظاہر کی اور فساد شروع کرادیے گئے اور اب انگریز چلے گئے (جسمانی طور پر) تو ان گدی پانے والوں کو اس نام نہاد آزادی کا پول کھلتا نظر آیا۔ ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مذہب کی آڑ لے کر ملک کا بٹوارہ کرڈالیں۔ نیز مرے پر سو دُرّے آپس میں ایسے خون خرابے کرادیں کہ ایک عرصہ کے لئے متحدہ محاذ کا ڈر دور ہوجائے اور اس بٹوارے کو قائم رکھنے کے لئے ابدی مخاصمت پیدا کرنے کی ضرورت ہے انھیں اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایم۔ اسلم نے رقص ابلیس کی تخلیق فرمائی۔

لیکن رجعت پرستی کے علاوہ اس ناول میں نہ دم ہے نہ دلچسپی۔ انداز بیان نہایت بچکانہ اور پھس پھسا۔ کسی ایک بھی واقعے پر اصلیت کا دھوکا نہیں ہوتا کیونکہ شروع سے آخر تک ایک واقعہ بھی موثر طریقے سے نہیں پیش کیا گیا۔ کردار نہایت بوسیدہ اور بھونڈے ہیں۔ ساری ناول میں بس دو احمق قسم کے آدمی ٹوٹے پھوٹے مکالموں کے ذریعے سُنی سنائی اُڑاتے ہیں۔ وہ بھی اتنی روکھی پھیکی طرح کہ جی اکتانے لگتا ہے۔ کتاب کا ہیرو یعنی محبوب الٰہی جو مشرقی پنجاب میں سب کچھ لٹا کر ماں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرکے آیا ہے۔ جس کی ایک شب کی بیاہی دلھن کو سکھ اٹھالے گئے ہیں، نہایت مزے سے چاق وچوبند، صاف بستر، باورچی خانوں اور شکروغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے لیکن آخر میں اس کی اغوا شدہ دلھن اسٹنٹ کوئین کی ہیروئن کی طرح سب کو مارتی پچھاڑتی صحیح وسالم بالکل پاک دامن لوٹ آتی ہے۔ پورے ناول میں ایک فرقہ کی طرف سے دوسرے فرقے کی سات پیڑھیوں کو کوسا ہے اور گالیاں دی ہیں۔

اگر کوئی دوسرا اس ناول کو اسی نظریے کے ماتحت لکھتا جس کا زورِ قلم ایم۔ اسلم سے زیادہ ہوتا۔ تو واقعی یہ ناول خطرناک ہو سکتی تھی لیکن یہاں تو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں

خیر ناول کو چھوڑیے اصل چیز تو اس کا دیباچہ ہے جو حسن عسکری صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پہلے ہی صفحہ کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ناول میں کیا کچھ ہے اور کس بھدے طریقے سے ہے۔ ایم۔ اسلم حسن عسکری اور شاید عزیز احمد کے سوا پاکستان میں کسی ادیب نے خواہ وہ ترقی پسند ہے یا نہیں رقصِ ابلیس کو نہیں سراہا اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رجعت پسندوں کا محاذ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مضبوط نہیں۔

ایم اسلم کی چوٹ پر راماننداساگر نے بھی ایک ناول "اور انسان مرگیا" لکھا۔ یہ دونوں ناول میں نے ایک ہی وقت میں دیکھے۔ "تکنیک کو چھوڑ کر جہاں تک مواد اور نظریے کا سوال ہے دونوں میں بڑی قریب کی مشابہت ہے۔ راماننداساگر ترقی پسند نہیں تو رجعت پسند بھی نہ تھے۔ انھیں ایم۔ اسلم کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کرتے مجھے بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں خود وہاں جا کھڑی ہوئی ہوں کیونکہ راماننداکو میں نے ہمیشہ اپنی برادری کا ایک فرد گردانا اور یہاں انھیں اور ایم۔ اسلم کو ہم خیال دیکھ کر دکھ ہوا۔

مثلاً "رقص ابلیس" میں ایم اسلم نے یہ دکھ بیان کئے ہیں جو سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے۔

"اور انسان مرگیا" میں راماننداساگر نے وہ دکھ بیان کئے جو ہندوؤں

اور سکھوں پر مسلمانوں نے کئے ہیں۔

ایم۔ اسلم کے یہاں بھی ایک سکھ موجود ہے جو مسلمانوں کی جان بچانے کو اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔

راما نند ساگر کو بھی ایک مسلمان مولانا مِل جاتے ہیں جو یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔

ایم۔ اسلم کی ہیروئن کو سکھ اٹھائے جاتے ہیں اور راما نند کی ہیروئن کو مسلمان۔

مگر یہاں ایم۔ اسلم نے راما نند ساگر سے زیادہ ترقی پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ جب ان کی ہیروئن خورشید پاکستان لوٹ آتی ہے تو اس کا شوہر اسے بغیر صفائی ہی کے قبول کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔

راما نند ساگر کی ہیروئن جب لُٹ لٹا کر پلٹتی ہے تو وہ احمق ہیرو کی سرد مہری سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لیتی ہے۔ راما نند ساگر ایک گری ہوئی عورت کو اٹھانے میں جھجک گئے۔

ایم۔ اسلم کے یہاں خاتمہ بخیر ہے۔ مستقبل ان کے اپنے خیال کے مطابق روشن ہے۔

راما نند ساگر کے یہاں یاسیت ہے، حماقت کی حد کو پہونچی ہوئی ناامیدی ہے۔

ایم۔ اسلم کے کردار بچے کھچے جوڑے گئے ہیں وہ نئی زندگی شروع کر دیتے ہیں۔ راما نند ساگر کے کردار ذہنی اخلاقی اور جسمانی خودکشی کر لیتے ہیں۔ پاگل

ہو کر لوگوں کو کاٹنے دوڑتے ہیں اور اسی برتے پر ہمدردی کے امیدوار نظر آتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ رقص ابلیس کا دیباچہ حسن عسکری نے لکھا ہے۔

"اور انسان مرگیا" کا دیباچہ احمد عباس نے لکھا ہے اور اس میدان میں احمد عباس نے عسکری کی رجعت پسندی پر سبقت لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں "رقص ابلیس" ہی تخلیقی اور تعمیری ادب ہے۔

احمد عباس کہتے ہیں اندھیرے میں انھیں ایک ستارہ نظر آیا اور وہ رامانند ساگر تھا۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے انسان مرگیا۔ یہی انسان کے نہ مرنے کا ثبوت ہے۔

پتہ نہیں یہ کس قسم کا فلسفہ ہے۔ شاید رامانند ساگر اور احمد عباس ہی کی سمجھ میں آیا ہو کہ یا سیدیت ہی اصل رجائیت ہے۔ جب رامانند ساگر نے اپنے ناول میں ہر انسان اور حیوان کو مار ڈالا تو عباس قائل ہو گئے کہ موت ہی اصل زندگی ہے باقی سب حماقت ہے۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں فسادات کے اصل ذمہ دار سکھ ہیں اور ہندو مسلمان بیچارے تو صرف اپنے بچاؤ کے لئے کبھی کبھی مار بیٹھتے ہیں۔

احمد عباس کا خیال ہے کہ عوام ہی فساد کے ذمہ دار اور بانی ہیں۔ انھوں نے شوقیہ ایک دوسرے کا گلا کاٹا اور وہ بدیسی حکمرانوں اور سامراج کے سالہا سال کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ وہ یہی سوچتے ہوں گے کہ اس قسم کے

کے ذمہ دار عوام ہی نے پاکستان مانگا تھا اور انھیں کو ملِ گیا۔

پاکستان اور ہندستان کے اس قسم کے لوگ اپنی ایسی تحریروں سے اس طبقہ کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر اس بٹوارے اور فسادات کا اصلی بانی ہے۔ یہ طبقہ کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں بلکہ چند ملکوں کے سوا ہر حصۂ زمین پر اس کے پنجے گڑے ہوئے ہیں اور اسی قسم کی حرکتیں کر کے اسی قسم کے بہانے اور حماقتیں ڈھونڈھ رہا ہے۔

مگر ہمیں خوف زدہ یا نا اُمید نہ ہونا چاہیئے۔ اس قسم کے ادب کو نہ ہی عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور نہ ہی اپنایا ہے۔ ممکن ہے وقتی طور پر عوام بہک جائیں۔ مگر ان ڈھول تاشوں سے انھیں زیادہ دن نہیں بہلایا جا سکتا۔

اس تعمیری اور تخریبی ادب کے درمیان اور کڑیاں بھی ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہے جس کا اظہار ممتاز شیریں کے افسانہ "بھارت ناٹیہ" میں کیا ہے۔ اس افسانے کا لب لباب یہ ہے کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ خوب ہوا پہلے تو اسے ذرا سی تکلیف ہوئی مگر پھر وہ قائل ہو گئی کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ یہاں انھوں نے ہندستان کو ایک ماں بنا کر لفظ ماں کو کیچڑ میں اوندھے مُنہ گرا دیا ہے۔ بھلا ایسی بھی دنیا میں کوئی ماں ہو گی جس کا بچہ چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا گیا تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی کہ آہا ہا! دو دو ہو گئے۔ میرے دونوں بیٹے۔ یہ مثال نہایت بھونڈی اور بھیانک ہے۔ محترمہ سے میری درخواست ہے کہ اگر وہ خود ماں ہیں تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ بچے کے بارے میں ان کا اتنا مضحکہ خیز نظریہ ہے اور جو وہ اس جھمیلے سے آزاد ہیں پھر بھی کم سے کم وہ عورت تو ہیں جو ماں اور بچے

کے رشتے کی ایسی تضحیک کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور اس کی درگت نہ بنائے گی۔ یہ نظریہ ویسے بھی بغیر اس مثال کے کچھ بے تکا سا ہے کہ اگر ایک چیز کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو وہ زیادہ پھلے پھولے گی۔ سالم نہ پھل سکے گی۔ محترمہ ایک نہایت خوفناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ تقسیم کر دینے سے ممکن ہے دھارے کا زور دھیما پڑ جائے لیکن اگر اتفاق سے یہ دو ٹکڑے مل گئے تو پھر اس سیلاب کو کسی قسم کی روک تھام اور پیش بندی نہ روک سکے گی۔ وہ جزائیں جو اس بٹوارے سے کمزور پڑ گئی ہیں اگر متحد ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا۔ انھوں نے نہیں سوچا، مگر یہ میری غلطی ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر باقاعدہ پروگرام کے مطابق یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ گو یہ بڑے مصنوعی حربے ثابت ہوں گے مگر فی الحال تو یہ ادب تخریبی ادب سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ تخریبی ادب کا مقصد تو صرف توڑ پھوڑ ہے مگر یہ ادب پیڑ کی جڑ کو کھوکھلا کر کے اس میں نیا بیج ڈالنے کی سازش ہے، اگر یہ بیج جڑ پکڑ جائے تو انسان کو جھوٹی امید اور کھوکھلے وعدوں کے چکر میں پھنسا کر قوتِ ارادی کو کچل دیتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ منٹو کے "سیاہ حاشیے" ادب پاروں کی فہرست میں شامل کروں یا ان کے لئے کوئی نئی جگہ تلاش کروں منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے وہ سوچتا ہے کہ اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔ سب لوگ رو پیٹ رہے ہوں۔ وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو تو سب کے سب دم سادھ کر ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگیں گے

بس دھاک بیٹھ جائے گی سکہ جم جائے گا۔ اس حربہ کے ذریعہ سے منٹو نے بہت دفعہ لوگوں سے خراج وصول کیا ہے مگر اس دفعہ اس کا وار کچھ اوچھا پڑا۔ ویسے سیاہ حاشیے، ادبی شہ پارے اور غیر فانی عجوبے نہیں تو بالکل کوڑا کباڑ بھی نہیں ان میں سے بہت سے ٹکڑے خوبصورت ہیں کہ پڑھ کر جی بھر آتا ہے لیکن دیباچہ نویس نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ انھیں غلط لباس میں پیش کیا ہے لباس اپنی طرف سے منڈھ دیا ہے۔ یہ کہکر کہ منٹو ظالم کو ظالم نہیں کہتا، نہ جانے ان کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ سوچتے ہیں منٹو ظالم کو محبوب یا دلبر کہتا ہے۔ میرے خیال میں منٹو کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کہتا۔ وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیطان طبع لوگ خود اپنی جدت ہیں یا خدا نے انھیں ایسا ہی بنایا ہے۔ معاشی اور اقتصادی اور سیاسی طاقتوں کا اس تعمیر میں ہاتھ نہیں۔ عسکری صاحب کا فلسفہ ہے کہ "مارنے والوں کو منع نہ کرو وہ نہ مانیں گے" تو کیا ان کی رائے ہے کوئی سر پہ ایک لٹھ مارے تو اس سے کہیں گے بھائی چار اور مار لے۔ یہ مقدس جذبہ عسکری صاحب میں ہو تو ہو کسی عقلمند انسان میں تو نہیں اور منٹو میں تو ہرگز نہیں۔ منٹو تو ایک بار سمجھائے گا۔ دو بار سمجھائے گا۔ تیسری بار اگر لاتوں کے بھوت باتوں سے نہ مانے تو لاتوں ہی سے سمجھائے گا۔ عسکری صاحب نے منٹو کا نظریہ مسخ کر کے پیش کرنے میں نہ جانے کیا لذت محسوس کی مگر یہ ہوا بُرا۔ منٹو کے لئے منٹو سب کچھ ہو سکتا ہے متعصب نہیں ہو سکتا۔ کسی کے بنائے بھی نہ بنے گا۔ فساد پسند نہ بنے گا۔ وہ انسان جو دنیا کی ذلیل ترین ٹھکرائی ہوئی طوائف کے لئے اپنے قیمتی آنسو بہا سکتا ہے۔ جو دلال جیسے رذیل

حیوان کے دل کو ٹٹول سکتا ہے۔ جس کی حساس ناک عطر کی خوشبو کی متحمل نہیں ہو سکتی صرف اس لئے کہ اس خوشبو میں تصنع ہے، بناوٹ ہے۔ قریب ہے وہ لاشوں پر قہقہہ لگا کر نہیں اچھل کود سکتا۔ وہ ظالم کو ظالم کہتے بھی نہیں ڈر سکتا، وہ فساد کو روکنے کیوں جھجکے گا۔ ہمیں کہیں دھوکا ہوا ہے۔ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کسی پوشیدہ مطالب کی خاطر منٹو کی تحریر کو آلہ کار بنایا گیا ہے۔ منٹو کا طرز تحریر کبھی کبھی اُلجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ گھما کر کہنے کا عادی ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ سیاہ حاشیے منٹو نے ہنس کر نہیں لکھے اور ہنسانے کے لئے نہیں لکھے اور نہ ہی کبھی وہ رجعت پسند ادب لکھے گا۔ خواہ اس کو کتنے ہی جھانسے دیے جائیں۔

یہ ہے اس ادب کی ایک جھلک جس نے فساد کے بیچوں بیچ جنم لیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس میں سے کیا کچھ غیر فانی بنتا ہے۔ اور کیا کچھ عطار کی دکان پر پڑیاں باندھنے کے کام میں آتا ہے۔ یہ کہہ دینا یہ سب ہنگامی ادب ہے اور اس ہنگامے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور مقبولیت ختم ہو جائے گی غلط ہے۔ ہر زمانہ کا ادب ہنگامی ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی وقت ہنگامہ جو کچھ لکھا وہ غیر فانی صورت اختیار کر چکا ہے۔ گورکی کی تحریریں کبھی ماند نہ پڑیں گی۔ حالانکہ جس ہنگامہ کے سلسلے میں اس نے لکھا وہ اس کے ملک میں ختم ہو گیا۔ مگر اس کا ایک ایک حرف اب بھی لوگ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ تمام جو غلامی کی کریہہ رسم پر لکھا گیا۔ ہنگامی ہوتے ہوئے بھی لافانی بن گیا۔ اسپین کی بغاوت ختم ہو گئی لیکن FOR WHOM THE BELL TOLLS کی عظمت قائم ہے۔

لہٰذا وہ لوگ جو فسادات پر لکھے ہوئے ادب کو ہنگامی ادب اور وقتی پروپگینڈا کہہ کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو خود کچھ نہ لکھ سکے، یا شاید اس ادب کو اپنے مطلب کے خلاف پا کر اسے گمنامی سے ڈرا کر میدان صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کی فنا اور بقا۔ نفس مضمون اور ادیب کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ اس ادب کو وقتی ادب کہنا تنگ نظری کی دلیل ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر ہنگامہ غیر فانی ادب پیدا کر سکتا ہے مثلاً اگر کسی نواب صاحب کے لاڈلے کتے کی شادی پر سہرا لکھا جائے یا کسی کلکٹر صاحب کے تبادلے پر شہر کے ہیڈ ماسٹر صاحب الوداعی مرثیہ لکھ دیں تو وہ بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ غیر فانی ادب کو پیدا کرنے کے لئے ایک حساس دل کی ضرورت ہے اس طرف جہاں کی کوئی منزل ہو۔ ورنہ بقول شاعر

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

بہو بیٹیاں

یہ میری سب سے بڑی بھابی ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی کی سب سے بڑی بیوی۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میرے بھائی کی خدا نہ کرے بہت سی بیویاں ہیں۔ ویسے اگر آپ اس طرح سے ابھر کر سوال کریں تو میرے بھائی کی کوئی بیوی نہیں، وہ اب تک کنوارا ہے۔ اس کی روح کنواری ہے ویسے دنیا کی نظروں میں وہ بڑی بھابی کا خدائے مجازی ہے اور پون درجن بچوں کا باپ ہے۔ اس کی شادی ہوئی۔ دولھا بنا، گھوڑے پر چڑھا، دُلھن کو گھر لاکر پلنگ پر بٹھایا پھر پاس ہی خود بھی بیٹھ گیا، اور جب سے برابر بیٹھا رہا ہے۔ لیکن تصوف کی باتیں سمجھنے والوں ہی کو معلوم ہے کہ وہ کنوارا ہے اور صدا کنوارا رہے گا۔ اس کا دل نہ بیاہ سکا اور نہ کبھی بیاہ سکے گا، وہ نہ کبھی دولھا بنا نہ گھوڑے پر چڑھا نہ دلھن کو لایا نہ اس کے سنگ اٹھا بیٹھا۔ وہ تو اس کا باپ تھا جس نے اس کا بیاہ طے کیا۔ ایرے غیرے نتھو خیرے کی راسے سے۔ وہ بغاوت کے بخار میں جھلستا رہا مگر چوں نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ اس کے باپ کے ہاتھ بڑے

تگڑے ہیں اور جوتے اس سے بھی تگڑے اس لئے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ شہید تو ہو ہی رہا ہے جوتے سے شہید نہ ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا وہ دولھا بنا اور سہرے کے پیچھے تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ ایک اور سہرا بندھا ہے جو اس کے ارمانوں کے خون میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے جس میں اس کی نہ سنائی دینے والی سسکیاں پوری ہوئی ہیں۔ جس میں اس کے مسلے ہوئے جذبات اور کچلی ہوئی مسرتیں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا۔ اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر لگا دی گئی۔ وہ اپنی دلھن نہیں لایا بلکہ وہ ماں باپ کی دلھن تھی۔ ان ہی کی بیاہتا تھی۔

مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ وزاری کئے وہ دلھن کے پاس بھی گیا۔ اس کا گھونگھٹ بھی ہٹایا مگر وہ یہی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ خود وہاں نہیں، یہ اس کا باپ ہے جو اس دلھن کا دولھا ہے۔ مگر چونکہ میری بھابی اس وقت بڑی نہ تھی۔ میرا مطلب ہے جسمانی طور پر وہ دبلی پتلی اور نازک سی چھوکری تھی' اس لئے ایک لمحہ کو میرے بڑے بھائی کا جسم اس سے بیاہ گیا لیکن بہت جلد ہی وہ دبلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی اور چند سال ہی میں وہ بھول بھال کر بے تکے گوشت کا ڈھیر بن گئی۔ میرے بھائی نے اس کے اوپر چڑھتے ہوئے گوشت کو نہ روکا۔ اس کی جوتی روکتی۔ وہ اس کی تھی کون۔

لیکن وہ بچے .... اس کے ماں باپ کے بچے جنھیں وہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھوتا تعداد میں بڑھتے رہے۔ ٹانگیں سرسراتے، میلی ٹانگیں اچھالتے

واویلا مچاتے مگر میرے بھائی کے دل کے دروازے ویسے ہی بند رہے وہ ایسا ہی کنوارہ اور بانجھ رہا۔ میری بھابی کچھ ایسی ان مرحلوں میں پھنسی کہ اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہ دیکھا۔ جانے کہتی ہوں، میں تو پہلے ساس سسر کی بہو ہوں، نند کی بھوجائی ہوں، بچوں کی امّاں ہوں نوکروں کی مالک ہوں، محلّے ٹولے کی بہو بیٹی ہوں پھر اگر وقت ملا تو تمھاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔

بھیا کو اس طرح کی ساجھے کی ہانڈی بڑی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ لگی اور اس نے اپنا دل سنبھال کر اٹھایا۔ بکھرے ریزے سمیٹے اور تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے کتنے ہی آستانوں پر اس چکنا چور شیشے کے ٹکڑے کو جا کر رکھا، مگر کوئی مرہم کوئی دوا ایسی نہ ملی جو ان ریزوں کو جوڑ دیتی اس لئے وہ اب بھی اپنا کنوارا دل لئے پھر رہا ہے کسی دل والی کی تلاش میں۔

اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھے پر ڈھونڈا۔ گندی گلیوں میں گھومنے والی کنھیائیوں میں تلاش کیا۔ ریڈیو اسٹیشنوں پہ گانے والی حسیناؤں اور آرٹسٹوں میں ٹٹولا۔ ہسپتالوں کی نرسوں میں بھی جستجو کی۔ فلمی پریوں کی گپھاؤں میں بھی بھٹکا اور ایکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ میں بھی جھانکا۔ جاہل گاؤں کی گنواریوں، سڑک کی کوٹنے والیوں۔ مچھیرنوں اور بھٹیاریوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا۔ ڈرائنگ روم میں اُگنے والی اور بال روم میں تھرکنے والی شریف زادیوں سے بھی بھیک مانگی مگر اسے دل والی کہیں نہ ملی لاکھوں ہی گھونگھٹ پلٹ ڈالے مگر وہی عورت وہی ساس سسر کی بہو وہی اُن کے ہی لال بچوں کی ماں دکھائی دی

میری بھابی سب سے بڑی تھی، مگر زیادہ عقلمند ہرگز نہیں۔ اُس نے

میاں کو چھوٹے بہلاوے کبھی نہ دیے۔ جیسے پہلے ہی رات کو وہ سمجھ گئی ہو کہ اپنی جان گھسانا حماقت ہے ان تلوں سے تیل نہ نکلے گا اور وہ دنیا سے جی کرڑا کر کے کالے کلوٹے، ٹیڑھے بھینگے بچے تو خود بخود اس کے پیٹ میں تعمیر ہوتے رہے وہ تو ابکائیاں لینے اور بدوضع بننے کے سوا کچھ بھی نہ کرتی رہی اور یہ بچے میرے بھیا سے انتقام لینے کا مفید آلہ ثابت ہوئے۔ جب ناک چلتے۔ ننگ دھڑنگ بسورتے ہوئے کینچوے کسی محفل یا پارٹی میں میرے بھیا کو چھو دیتے ہیں تو وہ ایسے اچھل پڑتے ہیں جیسے بچھو نے چٹک لیا ہو اور جب کبھی بھولے سے کوئی احمق مہمان گھر میں گھر جاتا تو یہی تہذیب اور نفاست کے قاتل ادب اور سلیقہ کے دشمن اس کی چھاتی پر کود دل کر اس کو ڈوب مرنے کی ترغیبیں دیا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گھر کے میلے بچھونے میلے فرش اور چھپلاندے برتن ایک نفیس دماغ روح کو ابدی مرگھٹ میں سلگانے کے لئے کافی نہ پاکر میری بھابی نے جملہ ترکیبوں اور خوش گفتاریوں کے زریں نسخے استعمال کر کے آنے جانے یا مستقل رہنے کے شوقین رشتہ داروں کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا ہے۔

اسی لئے تو بیچارہ دل والی کی تلاش میں زر زمین لٹاتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی اسے کوئی محبوبۂ دلنواز موقع پاکر اس کا فرنیچر فروخت کر کے، مکان پگڑی پر اٹھا کر حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی اپنے نئے عاشق کے لئے لے کر بھاگ جاتی ہے اور وہ پھر ویسا ہی لنڈورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی اسے عشق راس نہیں آتا جہاں کے لوگ آوارگی کرتے ہیں۔ یہ

گھنٹیاں کسی کے گلے میں نہیں لٹک جاتیں۔ وہ تو اگر بھولے سے کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لیا تو وہ عورت فوراً حاملہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جان پر ایک عذاب تحفہ نازل کر دیتی ہے جیسے وہ بلی کے گو کی طرح چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جائز بچوں سے ذرا نہیں شرماتا مگر اس کی علتوں سے اس کی عزت پر حرف آنے کا خوف ہے، وہ بڑا باعزت ہے نا۔

وہ اپنی اس مصیبت کو دنیا کی سب سے بڑی آفت سمجھتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا اجاڑ پڑی ہے تو لوگوں کو بھوک، مہنگائی اور بے کاری جیسی بے مصرف چیزوں کے بارے میں کچھ سوچنے کا کیا حق ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے۔

آپ سمجھیں گے کہ وہ کوئی جنسی مریض ہے، عورت کا بھوکا ہے۔ جی نہیں اس ظالم عورت کی وجہ سے تو اسے بارہا شدید قسم کی بدہضمی بھی ہو چکی ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول کی پیدائش ہے۔ جہاں غم دنیا کو غم عقبیٰ کی آڑ میں چھپانا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں ہر جسمانی محرومی کا الزام نصیب کے سر اور روحانی تشنگی کا ٹھیکہ معشوق کے ذمے وہ قسمت کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑا ہوا ہے۔ ایک دن اسے نصیب کہیں دبکا ہوا مل جائے گا اور وہ اس کا سر پاش پاش کر دے گا پھر وہ ہوگا اور اس کی محبوبہ لیکن اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس کا نصیبا اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہے اور اس کی چڑھی چڑھی آنکھوں کو کبھی نظر نہ آئے گا۔

اور ان کڑوے کسیلے ماں باپ اور فرسودہ نظام کے سائے میں یون درجن بچے پروان چڑھ رہے ہیں۔ آنے والی پود اگ رہی ہے اور زندگیاں سانچوں میں ڈھل رہی ہیں۔ نامعلوم منزل تک گھسٹنے کے لئے دنیا میں تلخی اور افلاس کی پال پوس

کرنے کے لئے۔

یہ میری دوسری بھابی ہے۔ میرے بھائی کی انمول دلھن۔ اس کی قسمت کا چمکتا دمکتا سورج اس کی مشعل راہ۔ میرا بھائی بڑا ہی تقدیر والا ہے اس نے ایک غریب گھر میں جنم لیا۔ دیوں کی ادھ مری روشنی میں پڑھ پڑھ کر ایک دن جب روشن ستارے کی طرح جگمگایا تو ایک بڑی سی مچھلی آئی اور اسے ثابت نگل گئی۔

جوں ہی اس نے اول نمبروں سے بی اے۔ پاس کیا نواب گھمن کی نظر التفات اس پر پڑ گئی۔ نہ جانے کدھر کے رشتے ناطے جوڑ توڑ کر یہ وفیسروں کے ذریعے کانٹا مارا اور دیکھتے ہی ایک چھوڑ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے پھر اسے اپنی سب سے چہیتی باندی کی سب سے لاڈلی بیٹی کو بخش دیا۔ بادا بھیترا ہید کے نگر ایک طرف تو تھی نواب زادی اور انگلینڈ جانے کا خرچہ اور دوسری طرف کھوسٹ باپ اور اپاہج ماں اور بن بیاہی بہنوں کی پلٹن کی پلٹن اور ادھ پڑھے بھائیوں کی فوج۔ ظاہر ہے کہ بازی بڑے حلق والی مچھلی کے ہاتھ رہی اور بقیہ جونکیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ اماں کو سمدھن بننے کا شوق۔ بہنوں کو نیگ اڑانے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی اور پوت پتنگا بن کر سات سمندر پار اڑ گیا۔

اماں نے جی پر پتھر رکھ لیا تھا کہ بلا سے ہڈی نچی ہے تو جہیز ہی سے آنسو بجھ جائیں گے۔ ماشاء اللہ اتنے سامان سے پلٹن کے دو چار بیاہی تو لیس ہو جائیں گے۔ دولھا کی سلامی سے ہی دو تین بھائیوں کی ناؤ پار اتر جائے گی۔ مگر سارے ارمان سارے حوصلے پھر سے اڑ گئے جب نواب کی ایک کوٹھی دلھن کا مانگا اور دوسری سسرال بنی اور بھو ایک کوٹھی سے

دوسری کوٹھی کو بیاہ دی گئی۔

انگلنڈ سے لوٹ کر دولھا بیاہ کر سسرال چلا گیا اور اماں باوا نئے سرے سے دوسرا پودا سینچنے پر جٹ گئے۔ پھر کسی دن اس پودے کے چکنے چکنے پات کسی باغبان کو نظر آ گئے تو وہ اسے بھی اس گھورے سے سمیٹ کر اپنے "سرہاوس" میں لے جا کر رکھ دے گا اور اماں باوا ایڑیاں رگڑتے آخری منزل کو جا کر پکڑ لیں گے۔

اب یہ پہلا پودا اپنے سسر کی ریاست میں کسی مفت خوروں والے عہدے پر فائز ہے۔ علاوہ تنخواہ کے موٹر۔ گھوڑا گاڑی، کوٹھی، بنگلہ۔ نوکر چاکر اور ایک عدد نواب زادی اسے ملی ہوئی ہے صبح اٹھ کر دربار میں تین سلام جھاڑ چکنے کے بعد وہ دن بھر پڑا کوٹھی میں اینڈتا ہے۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی حیثیت افزائش نسل کے لئے استعمال کئے جانے والے سانڈ سے زیادہ نہیں جو تھان پہ بندھا اگلی ہوئی قے کی جگالی کئے جا رہا ہے۔

اس کی بیوی یعنی نواب زادی کبھی اس کے غلیظ گھر نہ آتی مگر جب بوڑھے باپ نے دنیا کی جنگ سے عاجز آکر ہتھیار ڈال دیے تو وہ مع اپنے پورے نام جھام کے دو گھڑی کو آئی۔ اس وقت بیچارے نوابی داماد کی شرم کے مارے بری حالت ہو گئی جیسے گورنر و وائسرائے کی سواری آ رہی ہو تو ایک صاف سی سڑک چن کر جھنڈیاں لگا دی جاتی ہیں تاکہ وائسرائے سمجھے کہ سارا ملک ایسا ہی صاف اور جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے۔

اس طرح گھر کا سارا کوڑا کرکٹ نظروں سے اوجھل رکھ دیا گیا۔ میت اٹھنے سے پہلے ہی نواب زادی اٹھ کر چل دیں اور

ساتھ ساتھ وہ داماد بھی۔

مگر بڑے حساس دل کا مالک ہے وہ سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے دل پر برف کے گھونسے ہردم لگا کرتے ہیں اس لئے وہ جلد از جلد اس ماحول میں سمونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور خود فراموشی کے لئے شراب پیتا ہے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سہانے موسم آگئے ہیں اور آس پاس کی ریاستوں کے رنگین مزاج سیر و شکار کو آجا رہے ہیں اس کی بیوی دوسری نواب زادیوں کی طرح ہرنی بن کر چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ وہ خود تین سلام جھاڑ رہا ہے۔ آرام دہ کمرے میں سر و پیر سے بے خبر پڑا ہے۔ اب تو اسے اپنی رفیق زندگی کی آنکھوں میں سے گذرتے ہوئے سوال بھی نہیں جگ سکتے۔ وہ یہی تو کہتی ہے کہ "تمھارا مصرف کیا ہے؛ میرے باپ کی جلد بازی نے تمھیں اس جنت ارضی میں لا ڈالا ہے اسے غنیمت جانو۔ جو یہ نہ ہوتا تو جوتیاں چٹخاتے پھرتے"۔ ایسے موقع پر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹخے اور..................

مگر وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ انگلینڈ سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تو لا نہ سکا۔ اس کے جاتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو دل کے دورے پڑنے لگے اور انھوں نے رو رو کر اسے واپس بلوا لیا اس لئے بیچارے کی حالت ایسی نیم پخت روٹی جیسی ہے جو قبل از وقت توے سے پھسل کر گھی میں آن گری ہو، اوپر سے کاہلی اور بے کاری کی پھپھوند نے اسے اور بھی بے مصرف بنا دیا۔ وہ ایر کنڈیشن کمروں میں سو سو کر

اپنی پرانی کچی کھپریل سے کانپنے لگا ہے۔ فلش کا عادی ہو کر اسے غلیظ کچے سنڈاس کے خیال سے بخار چڑھتا ہے۔ اس کی قسمت کا ستارہ بلندیوں پر ٹمٹماتا ہے۔ جسے پکڑنے کے لئے وہ آوارہ بگولے کی طرح سرگرداں ہے۔

اور جب وہ بہت تھک جاتا ہے تو غصے میں آ کر وہسکی کی مقدار پیگ میں دوگنی کر کے پرسکون جمائیاں لینے لگتا ہے۔ یہی اس کی کشمکش ہے اور یہی زندگی کی جد وجہد۔ نمک کی کان میں جا کر وہ بھی تو نمک کا کھمبا بن چکا ہے۔

جب ان نمک کی کانوں پر پھاوڑوں کی چوٹ پڑے گی اور ان کے پرخچے اڑا کر روٹیوں میں گوندھ ڈالے جائیں گے تو اس خالص نمک کے تودے کی روٹی نمکین نہیں بلکہ کرکری ہوگی، پھر اس کرکری روٹی کا نوالہ بھی تھوک دیا جائے گا۔

میری ایک بھابی بھی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہے، اسے ایک کامیاب بیوی بننے کی مکمل تعلیم ملی ہے۔ وہ ستار بجا سکتی ہے، پینٹنگ کر سکتی ہے، ٹینس کھیلنے، موٹر چلانے اور گھوڑے کی سواری میں مشاق ہے۔ بچوں کی پرورش آیا سے بخیر و خوبی کروا سکتی ہے۔ بہ یک وقت سوڈیڑھ سو مہمانوں کی آؤ بھگت کر سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے بیرا لوگ کو اپنی نگرانی میں لے کر بڑے لاڈ پیار سے اس کی کانوینٹ میں تربیت ہوئی اور جب خدا رکھے سن بلوغ کو پہونچی تو اس کے روشن خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہار امیدواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی۔ سی۔ ایس بھی تھے اور پی۔ سی۔ ایس بھی تھے۔ حسین اور تعلیم یافتہ بھی تھے، بدصورت اور دودھاری گائیں بھی اشرفیوں کے تھیلوں کے ساتھ منہ کا مزہ بدلنے کو کچھ ادیب بھی اور شاعر بھی اور پھر

اس سے کہہ دیا کہ بیٹی تیرے آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی۔ خوب ٹھونک بجا کر ایک بکرا چھانٹ لے۔

سو اس نے خوب جانچ پڑتال کر ایک اپنے ہی پلے کا بھاری بھرکم چن لیا اور اس پر عاشق ہو گئی جس کی داد اس کے والدین نے عظیم الشان جہیز کی صورت میں دی۔

لوگ اس ہنس ہنسنی کے جوڑے کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور وہ بھی شدت الفت میں بیتاب ہو کر ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی ایک ہی فرمے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج یکساں پسند اور ناپسند یکساں، غرض ہر بات یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر ہیں دونوں ایک ہی سوسائٹی کے چہیتے فرد ...... ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے، وہ مہینوں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔

میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل رہا ہے اور بیوی اس کے ایک ہم عصر سے مانوس ہے جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے جس کی اپنی بیوی ایک بوھل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے۔ جس کی پرانی چہیتی دو بیوی پنجرے الجھی ہوئی ہے جو اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے جو ملٹری کے نوعمر ...... اُنھ چھوڑیے بھی کیا فائدہ دخل در معقولات سے۔ میرے بال نائی کے پاس نائی کا استرہ میرے پاس۔ میرا استرہ گھسیارے

کے پاس۔ اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دُم لئے دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میری بھابی بھی اس زنجیر کا ایک حلقہ ہے اور وہاں جب تک لٹکی رہے گی جب تک زنجیر کرۂ ارض کو جکڑے رہے گی۔

اور میری تیسری بھابی تو جگ کی دلھن ہے۔ وہ اُس سڑک کے مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں۔ اس چھاؤں کی طرح ہے جو ہر تھکے ماندے کو اپنی آغوش میں تھپکیاں دے کر خود فراموشی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ وہ ساجھے کی ہانڈی ہے جو آخر میں چوراہے پر پھوٹے گی، وہ جنھیں منہ کا مزا بدلنے کے لئے نعمت خانہ میں مال مصالہ رکھنے کی توفیق نہیں وہ اس صلائے عام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں وہ روز شام کو نئے دولھا کی دلھن بنتی ہے اور صبح کو بیوا ہو جاتی ہے وہ اپنی ان بہنوں سے خوش نصیب ہے جو اللہ کی دین سے ایک شب میں دس بارہ بار دُلھن بنتی ہیں۔ دس براتیں چڑھتی ہیں اور دس بار رانڈ ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ناک چڑھی پڑوسنوں کی طرح اس پر ٹیڑھی ٹیڑھی نظریں ڈالتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ کچھ نیچ ہے۔ کوئی گناہ کر رہی ہے۔

مگر خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا پاپ کر رہی ہے۔ دنیا میں کیا نہیں بکتا اور کیا نہیں خریدا جاتا۔ جو لوگ اسے جسم بیچتا دیکھ کر اتنا بلبلا اٹھتے ہیں کیا لوگ پیسے کے عوض اپنے دماغ نہیں بیچتے اپنے تخیلات کا سودا نہیں کرتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچتے۔ معصوموں کا خون بھی تو آٹے میں گندھ کر بکتا ہے۔ کاری گر کا

گاڑھا پسینہ بھی تو کپڑے کے تھان رنگ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک کلرک کی پوری زندگی چالیس روپیہ مہینے پر بک جاتی ہے۔ ایک ٹیچر کی پوری عمر کا سودا اتنے ہی داموں پر ہو جاتا ہے، تو پھر اس جسم خاکی کے لیے کیوں اتنی نے دے۔

اور اس کا باپ کالے بازار کا مغز ستون تھا۔ اس کا بھائی ناجائز ذرایع سے ناجائز لوگوں تک پہونچاتا تھا، اس کا دوسرا بھائی پولیس کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔ اور دنیا ان سب کو جانتے ہوئے بھی انہیں گلے سے لگائے بیٹھی ہے۔ وہ بھی تو آخر انھیں میں سے ایک ہے جہاں آوے کا آوا ٹیڑھا ہے وہاں اس کی بھی کھپت ہونی چاہیئے۔

ویسے وہ کوئی پشتہا پشت کی رنڈی نہیں اس میں اس کا کیا قصور، وہ آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لوگ نہ جانے کب اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کونے میں کھینچ لائے۔ اس نے یہی تو کیا کہ فلم اسٹار بننے کی خاطر ہر آستانے پر سر ٹکایا۔ فنانسر سے لے کر ایکسٹرا تک کے گھر کی خاک چھانتے چھانتے وہ خود چھلنی بن گئی۔ اس گڑبڑ میں وہ نہ جانے کون سا ریہرسل غلط کر گئی جو بجائے آسمانِ فلم کا درخشاں تارہ بننے کے وہ یہاں سڑک کے کنارے ٹمٹمانے لگی۔

یہی نہیں کہ اس نے شادی نہ کی ہو، اس نے اس کوچے کی بھی دشت پیمائی کر کے دیکھ لی، مگر شادی کے چند ہی مہینے بعد اس کا میاں، حسب معمول ادھر ادھر جانے لگا۔ وہ شاید تنگی ترشی میں بھی گزر کر لیتی، مگر وہ تو جتنے پیر سکوڑتی گئی اتنی ہی وہ چادر کترتا گیا۔

سوائے بیوی بننے کے اُسے اور کوئی ہنر نہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تو تیس پینتیس کی استانی گیری کر لیتی مگر اتنے روپئے سے تو اسے ٹیمپو کا خرچ چلانے کی بھی عادت نہ تھی، یا ہسپتال میں نرس بننے کی کوشش کرتی، اور ساٹھ روپئے کے عوض۔ خون، پیپ، کھانسی، بخار۔ قے دست میں قلابازیاں کھاتی۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی حماقتوں میں جان کھپانے کا شوق اس کے خمیر میں حلول نہیں مجبوراً اسے فلم کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔

رنگین فلم ہندوستان میں بنتے تو شاید اس کا میدا شہاب رنگ کچھ برق پاشیاں کر سکتا۔ لیکن ان کالے سفید فلموں میں اس کی چوڑی چکلی ناک اور چندھی آنکھوں نے اس کی لٹیا ڈبو دی۔ دو چار تھکی ہاری فلمیں بنا کر وہ فنانسر کی آغوش سے گر کر ڈائرکٹر کے پاس آئی۔ وہاں سے پھسلی تو ہیرو اور ساؤنڈ ہیرو کے ہتھے چڑھی، اس کے بعد ایک کیمرہ مین لیکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے جو ٹپکی تو قعر گمنامی میں کھسک گئی اور جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس بازار حسن میں معلق پایا مگر وہ اب بڑی سمجھدار ہو گئی ہے۔ اپنے گاہکوں کو بڑی ہوشیاری سے ناپتی تولتی اگر کسی دن کوئی موٹی مرغی، بدصورت بیوی اور غلیظ بچوں کی ستائی ہاتھ آ گئی تو وہ اُسے اپنا مستقل گاہک بنا ڈالے گی اور سرکار سے اس استقلال کا سارٹیفکٹ حاصل کر کے کالے بازار کے آئندہ ستون تعمیر کرنا شروع کر دے گی۔

یہ ہیں آدم و حوا کے جانشین، تخلیق کے علم بردار اور دنیا کی گاڑی کو چلانے والے جو بجائے چلانے کے اسے لات گھونسے سے آگے پیچھے ڈھکیل رہے ہیں۔

مگر ٹھہرئیے میری ایک اور بھابی ہے، پر وہ نہ جانے کہاں ہے۔ میں نے ایک آدھ بار صرف اس کی جھلک دیکھی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر ڈھلکے ہوئے زرتار آنچل کو دیکھا ہے۔ مگر اسے پرچم بنتے نہیں دیکھا۔ ان کی دودھ ایسی پیشانی پر محنت کی افشاں چنی دیکھی ہے۔ مگر اس افشاں میں اودے پیلے نیلے سب رنگ ہیں اور سہاگ کی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ میں نے اس کی حسین انگلیاں تو دیکھی ہیں، مگر انھیں الجھے بالوں کا پیچ و خم سلجھاتے نہیں دیکھا۔ اس کی سانولی شام کو شرمانے والی زلفوں کی گھٹائیں دیکھی ہیں مگر انھیں کسی کے تھکے ہوئے شانوں پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کا چکنا میدے کی لوئی جیسا پیٹ تو دیکھا ہے۔ مگر اس میں ابھی نئی امید کے پودے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھا میں نے اس کی چتونیں دیکھی ہیں مگر انھیں شمشیر بنتے نہیں دیکھا۔

سنتے ہیں سنہرے دیسوں میں وہ آن بسی ہے اور ماتھے کی افشاں اب سہاگ کا سیندور بن چکی ہے .... اس کی مہکتی زلفیں چوڑے چکلے شانوں پر بکھر رہی ہیں ... ... اس کی پتلی پتلی انگلیاں الجھے بال ہی نہیں سلجھا رہی ہیں بلکہ بندوقوں میں کارتوس بھر رہی ہیں اور تلواروں کی دھار پر اپنی تیکھی چتونوں سے سان رکھ رہی ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ... ... یہیں بہت قریب میرے پڑوس میں تلنگانہ کی البیلیاں، جی دار جوانوں کی آرتیاں اتار رہی ہیں۔ اور ان کے ہتھیاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر سیندور کے ٹیکے لگا رہی ہیں میرا ارادہ ہے کہ ایک دن میں بھی اس سرزمین پر جاؤں گی اور ان

سہاگنوں کے ماتھے کا تھوڑا سا سیندور مانگ لاؤں گی ...... اور اسے اپنی مانگ میں رچا لوں گی۔

اور پھر وہ میری چہیتی بھابی میرے دیس کے کونے کونے میں آن بسے گی۔ اگر ان ساس نندوں کے ڈر سے میری بھابی بن کر نہ آسکی تو میں دعوے سے کہتی ہوں، کہ وہ میری بہو بن کر تو ضرور آئے گی۔

بمبئی سے بھوپال تک

"بھئی واہ .... خوب گئے تم لوگ بھوپال!" یوسف نے مسرّت سے بلبلا کر کہا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔ یوسف صاحب اور بھوپال میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے ان کا کیا رشتہ؟

اگر آپ کو کسی ایسے آلے کی تلاش ہو جس کی مدد سے بغیر دماغ کھپائے یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی چیز ترقی پسند ہے اور کون سی رجعت پسند تو آپ یوسف سے رجوع کیجئے۔ جس بات پر یوسف گالیاں دے اور کاٹنے دوڑے سمجھ لیجئے وہ سو فیصدی ترقی پسند ہے اور جس پر وہ دانت نکال کر ہنسنے لگے وہ رجعت پسند ہے۔

اب اس ہی کی بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ یوسف کے خیال میں عسکری دنیا کا سب سے بڑا فلاسفر ہے۔ میراجی عظیم ترین شاعر ہے، اور عباس نے اگر کوئی سلیقہ کی چیز ساری عمر لکھی ہے تو وہ "اور انسان مرگیا" کا دیباچہ ہے۔ صحیح طریقہ جینے کا وہی ہے جس کی تصویر راما نند ساگر نے کھینچی ہے۔

تو پھر علی سردار جعفری کی گرفتاری کی خبر سُن کر جو ہماری صفوں میں بھگدڑ پڑ گئی، اسے دیکھ کر یوسف کی باچھیں کیوں نہ کھل جاتیں؟ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو میں شاید چڑھ جانے کی کوشش کرتی مگر سیما کے پاجامے نہیں سلے تھے، جانگیوں میں سردی لگتی۔ چلو اچھا ہی ہوا جو کچھ ہوا۔

جعفری نے بڑا اگھر لیا یا۔ کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے نام وارنٹ بھوپال کے مشاعرے کا تو مرثیہ لکھ گیا۔ جعفری ہی ہم لوگوں کو بھی ڈرا دھمکا کر بہلا پھسلا کر بھوپال لے جا رہے تھے، ادھر سے ڈھیل ملی، ادھر ہم سب کے سب کٹی پتلیوں کی طرح چت پڑ گئے۔

اتوار کے دن یہ فیصلہ کر کے کہ بھوپال تو جانا نہیں ہے چلو ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں سردار کی گرفتاری پر ذرا اظہار غم و غصہ ہی کر آئیں۔ اور جناب وہاں جا کر صورت حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جعفری کی غیر موجودگی میں کرشن چندر سالار اعلیٰ بنے مورچہ سنبھالے کھڑے تھے۔

"ہمیں بھوپال جانا ہے اور اب تو ضرور ہی جانا پڑے گا" سالار اعلیٰ نے الٹی میٹم دے دیا۔ اور تو شاہد لطیف جو عرصہ ہوا ادب کا دامن

چھوڑ کر فلم سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ جوش میں آ گئے اور کہا ہماری انتہائی بزدلی ہے کہ اگر ہمارا ایک ممبر پکڑا جائے تو ہم سب کے سب دبک کر رہ جائیں۔ ایک سردار کی گرفتاری نے ہم سب کی گردنوں میں کم ہمتی کا طوق ڈال دیا۔ بس جناب آگیا جوش اور میں نے راتوں رات سیما کے پاجامے سی ڈالے اور یہ مختصر سا لشکر چھ بڑے اور دو چھوٹے افراد پر مشتمل بھوپال روانہ ہو گیا۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، شاہد لطیف، مجروح، عادل رشید اور میں ایک بچی میری اور ایک عادل رشید کی۔ باقی کی رونق صندوقوں ناشتہ دانوں اور بستروں نے مہیا کر دی۔

ارادہ تو یہ تھا کہ تھرڈ میں جائیں گے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ تھرڈ کا ڈبہ ربر کا بنا ہوا نہیں، وہاں تو ہوا کی بھی مجال نہیں کہ پار سکے۔ ویسے تھرڈ کلاس کی تمام سہولات ریلوے کے محکمے نے بڑی کاوشوں کے بعد سکنڈ کلاس ہی میں مہیا فرما دی ہیں لہٰذا ہم لوگ بڑے آرام سے بستروں، پوٹلیوں اور صندوقوں کے نوک دار کونوں پر بیٹھ کر رمی کھیلنے لگے۔

اتنے میں عادل رشید نے چند پہاڑیوں کی طرف نہ جانے کون سی پہاڑی کو چھانٹ کر اشارہ کیا "حاجی ملنگ شریف" "حاجی ملنگ شریف" اور ہم سب اپنے چہروں پر تقدس کی گھٹائیں جمع کر کے پہاڑیوں کو گھورنے لگے۔ اس وقت مجروح کے پاس دو جوکر آئے تھے اور وہ مصر تھے کہ قبر پرستی کا خیال چھوڑ کر سب کو تاشوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، مگر ہم نہایت دل لگا کر دعا مانگ رہے تھے "یا حاجی ملنگ شریف! جوکر دلوایئے۔ یا

پیر دستگیر! جوکر دلوائیے"۔
"آپ لوگوں کو اعتقاد نہیں ہے اس لئے آپ کی دعا ہرگز قبول نہ ہوگی۔" مجروح نے موقع پاتے ہی جوکر پار کر دیا۔
اور میں سوچنے لگی۔ یہ اعتقاد کیا بلا ہے۔ ہم لوگوں کو ہر چیز پر اعتقاد رکھنے اور رکھوانے کی عادت کیوں ہے؟ کب تک مردوں سے اپنے حقوق مانگتے رہیں گے۔ مجروح کی طرح تاش کی گڈھی میں سے جوکر کیوں نہیں سرکا لیتے۔
"ٹھاٹ ہیں ان لوگوں کے" عادل نے جگہ کی قلت کی وجہ سے جسم توڑ مڑوڑ کر مختصر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "قبر میں پیر پھیلا کر سونے کی جگہ تو ملتی ہے"۔
"ان کے ہاں پگڑی وگڑی تو نہ بھرنی پڑتی ہوگی" مہندر ناتھ بولے "مگر چین کہاں ہے ان بیچاروں کے نصیب میں۔ دن رات کی دھما چوکڑی تو مچی رہتی ہے۔ کبھی بھوت اتر رہے ہیں، کبھی بے سُری قوالیاں ہو رہی ہیں۔ اور تو اور لوگ اپنی مُنہ چڑھی رنڈیوں کو لے کر داد عیش دینے بھی یہیں آتے ہیں۔ انسان مرتا ہے۔ زندگی کی دوڑ دھوپ سے تھک کر پیر پسارنے کے لئے، نہ کہ یوں اپنے سینے پر کودوں دلوانے کے لئے۔
"بھئی میں نے کبھی خطبۂ صدارت نہیں لکھا ہے اور نہ ہی اب لکھ سکنے کا ارادہ ہے۔" میں نے الٹی میٹم دے دیا۔
"ارے بالکل مشکل نہیں۔ گھنٹہ بھر میں لکھ جائے گا" سالارِ اعلیٰ نے اطمینان دلایا۔

"مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ وہ کم بخت لکھا کیسے جاتا ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ شروع کہاں سے کروں......... معزز حاضرین ، .... حاضرات ...."

"نہیں جی ان حماقتوں کی قطعی ضرورت نہیں" اس کے بعد انھوں نے تمام ہتھکنڈے خطبۂ صدارت لکھنے کے باقاعدہ سمجھانا شروع کر دئے جو میری کھوپڑی کے کسی سوراخ سے بھی گھسنے پر رضامند نہ ہوئے اور مجھ پر ہول سوار ہونا شروع ہو گیا۔

"میں خطبۂ صدارت ساری عمر نہ لکھ سکوں گی۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ ایک ایک پیراگراف بانٹ کر نہایت خوشخط لکھ ڈالیں، میں اُسے پڑھ دوں گی جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اور بھی کیا تھا۔

یہ جب کا واقعہ ہے جب میں نے پہلی دفعہ اسکول میں کام کرنا شروع کیا تھا ہمارے مینیجر صاحب نے حکم دیا۔

"ایک خطبۂ صدارت لکھ ڈالئے"

"معاف کیجئے گا مجھے خطبۂ صدارت لکھنا نہیں آتے۔"

"ارے اس میں بات ہی کیا ہے۔ گھنٹہ بھر میں لکھ جائے گا۔" انھوں نے کرشن چندر کی طرح چٹکی بجائی تھی۔

"آپ ایک گھنٹہ کہتے ہیں میں ایک برس میں بھی اتنی ثقیل چیز نہ لکھ سکوں گی۔"

"ہیں! یعنی خطبۂ صدارت ثقیل چیز ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ۔ اور قطعی بے ہودہ بھی ۔"

"معاف کیجئے گا اور آپ جو یہ بیہودہ، معاف کیجئے گا افسوسناک حد تک بیہودہ چیزیں لکھا کرتی ہیں ...." جل گئے

"مگر آپ خطبۂ صدارت تو افسوس ناک حد تک بیہودہ شاید لکھوانا پسند نہ کریں گے ۔"

"خیر صاحب میں ہی جھک ماروں گا ۔"

وہ خون کھولاتے رہے اور دو سکر دن بیچارے نہایت دقیق قسم کی جھک مار لائے ۔ مگر یہاں کوئی مینجر صاحب کی طرح جھک مارنے کو تیار نہ ہوا ۔

"آپ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دلوانا چاہتی ہیں ؟" کرشن نے طعنہ مارا ۔

"کون احمق مردوں سے برابری کرنا چاہتا ہے ۔ ہمارے حقوق اور ہماری ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور زیادہ رہیں گی ۔"

مگر کوئی طعنہ کوئی خوشامد اور کوئی دھمکی کارآمد ثابت نہ ہوئی ۔ کرشن چندر صرف چند پوائنٹ سے آگے نہ کہہ سکے ۔

"ارے حاجی ملنگ ، حاجی ملنگ !" عادل رشید پھر چلائے

"ارے بھئی یہ حاجی ملنگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں ؟" کرشن بولے ۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے ساتھ کانفرنس میں بھوپال جا رہے ہیں ۔" اور کرشن چندر نے تخیل کی لگام جھٹک کر چھوڑ دی ...." ان

پیر۔ فقیر لوگوں کی کیا کانفرنسیں نہیں ہوتیں ۔ اگر ان کی ایک کانفرنس ہوائس میں کلیر شریف، اجمیر شریف۔ غازی میاں۔ معین الدین چشتیؒ تشریف لائیں تو بھلا کس قسم کی بات چیت کریں گے۔ اُن کی کیا مشکلات ہوں گی۔

یہی کہ لوگ بڑے بیہودہ ہوتے جا رہے ہیں۔ نذر نیاز غائب خالی خولی دعائیں مانگنے چلے آرہے ہیں۔ ادھر بوہروں اور خوجوں کی آمد میں بھی کمی آگئی ہے۔ بڑے بڑے آسامی تو پاکستان کھسک گئے ہیں۔ اب ٹٹ پونجیے رہ گئے ہیں، سو یہ کس کام کے۔ باقی رہے ذہریے، سو ان کا حشر کا فروں کے ساتھ ہوگا۔"

"اُنھ تو پھر یہ لوگ بھی پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ دنیا کی منتیں مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ذرا اپنا مزار شریف کھسکا لے جائیں۔"

"کھسکانا ہی پڑے گا ایک دن بے چاروں کو۔ اپنے باپو کی کتنی ڈھیر ساری یاترائیں بن رہی ہیں۔ نئی یاتراؤں کے سامنے یہ بیچاری پرانی قبروں کی کیا چلے گی۔"

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ ہندستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔ یہاں مذہبی رواداری قائم رہے گی۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ جتنے حاجی ملنگ بنانا چاہیں آزادی سے بنا سکتے ہیں۔"

"ارے کفر کیوں بک رہے ہو کم بختو! حاجی ملنگ کو غصّہ آگیا تو ریل اٹھا کر پٹخ دیں گے" عادل رشید نے ڈرایا!

"سبوتاج ——— بڑا رکیک حربہ ہے" شاہد صاحب بولے۔

"اتنا ہی رکیک جتنا صفِ مخالف کے افراد کو جیلوں میں ٹھونسنا ہے، ان کی زبانوں پر تالے ڈالنا ہے، ان کے اخباروں کا گلا گھونٹنا ہے۔" کرشن نے تشریح کی۔

"شش شش۔ پتا چلو پتا" مہندر ناتھ بولے۔

اور ہم لوگ پیتہ چلنے لگے۔

ساتھ کھانا بھی تھا اور بھوک بھی، مگر ٹفن کیریر کھول کر کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مہم کو سر انجام دینے کے لیے خاص قسم کی نٹ بازی کی ضرورت ہے۔ نوالہ واقعی منہ کے بجائے ناک میں گھس رہا تھا۔ کچھ تو ڈائننگ کار کی لہریں اور کچھ ریل بھی ہل رہی تھی۔ اُدھر کوئی بکس کا کونہ چبھ رہا تھا اور کسی ہولڈال کا بکسوا ان کے آر پار ہو رہا تھا۔

"ارے صاحب انقلاب لانا مذاق نہ باشد۔ سالے یہ صندوق اور ہولڈال کس شمار و قطار میں ہیں۔ آج مجروحؔ انقلاب لانے کا پکا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ جب کوئی بھاری صندوق گھسیٹنے کا موقع آتا شاہد لطیف للکارتے۔

"میاں مجروحؔ! اسی برتے پر کہتے ہو انقلاب لانا ہے۔" اور جوش میں آکر مجروح بکس گھسیٹتے اور بستر گھسیٹتے۔ بچیوں کو باتھ روم لے جاتے ایسے کہ ان کے جوتے نہ خراب ہوں اور پھر بکس گھسیٹتے۔ اور اس شان سے کہ ہر بار کمپارٹمنٹ میں انقلاب عظیم کا لطف آ جاتا۔

کھانے کے بعد سونے کا اہم سوال اٹھا۔ کرشن چندر اور شاہد لطیف نے

انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم لوگ شرنارتھیوں کی سی مسکین صورت بن کر بیٹھ گئے۔ ایک سیٹ مجھے اور رسیما کو دی گئی۔ ایک سیٹ عادل رشید اور اُن کی لڑکی ناہید کو۔ ہم بچّے والوں کا تو انتظام ہو گیا۔ رہ گئی ایک چھوٹی سی سیٹ اور باقی چار آدمی۔ تھوڑی سی تو تو میں میں کے بعد یہ طے پایا کہ وہ سیٹ کرشن چندر اور مہندر ناتھ کو دے دی جائے۔ یقین مانئے وہ اچھے بھلے مرد نہ جانے کس طرح اپنے آپ کو توڑ مروڑ کر اس سیٹ پر اٹک گئے۔ رہ گئے شاہد اور مجروح۔ تو ان کی حالت یہ تھی کہ اگر سوئی کی نوک پر بھی لٹکا دئے جاتے تب بھی نہایت آرام سے سو جاتے۔ دو چار گٹھریوں، پوٹلیوں اور بڑی ساخت کے صندوقوں پر یہ لوگ بیٹھے، پھیلے، پھر خراٹے لینے لگے۔

بھسادل کے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ وہاں کے ترقی پسند مصنفین کو نہ جانے کس طرح خبر مل گئی کہ آج بھوپال جانے والے اِدھر سے گزریں گے وہ لوگ ہار پھول لئے اتنی سردی میں بے تکی رفتار سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں ایک ہی پیغام دیا کہ بھوپال میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں میدان ترقی پسند مصنفین کے ہاتھ سے نکل کر کہیں رجعت پسندوں کے قبضے میں نہ چلا جائے۔ یہ سُن کر اونگھتی ہوئی فضا چوکنی ہو گئی اور ہم لوگ اپنے گلوں میں ان کے ہار اور دلوں میں ان کا قصد لے کر روانہ ہو گئے۔ کسی ایک محاذ پر ہمیں شکست ہو گئی تو باقی کے کتنے محاذ کمزور پڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا۔

پلک جھپکتے رات گذر گئی۔ پو پھٹتے ہی مجروح نے حلق پھاڑ کر پکارنا

شروع کیا کہ چلے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ اگر فوراً نہ پی گئی تو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ بسکٹ بھی کھانے پڑیں گے ورنہ پیسے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ خیر صاحب چائے بھی پینی پڑی اور پچا سا بسکٹ بھی کھانا پڑا۔

مجروح ایک تو ترقی پسند شاعروں کے نمائندہ بن کر جا رہے تھے کیونکہ اللہ کے دیے ایک وہی باقی بچ رہے تھے۔ دوسرے دولھا بن کر بھی جا رہے تھے کیونکہ بھوپال سے انھیں سیدھے اپنی برات میں شرکت کرنے کے لئے جانا تھا۔ لیکن وہ نہایت کھرے پن سے جھینپ رہے تھے۔ جیسے اگر وہ دولھا بن گئے تو انقلاب نہ لا سکیں گے۔ شادی بذات خود ایک رجعت پسند فعل ہے۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ فریق مخالف گاؤں کی ایک ناخواندہ الھڑ دلھن ہو جیسی کہ مجروح کے پلے باندھی جا رہی تھی۔

"ارے بھئی تو کیا زبردستی ہے۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسی شادی؟" مہندر ناتھ جھلائے۔

"اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری گرہستی زندگی چکنی ہموار سڑک پر تیل دیے ہوئے پہیے کی طرح پھسلتی چلی جائے۔ مجھے ہچکولوں کی ضرورت ہے میں خانہ آباد ہو کر بیوی بچوں کی محبت میں اونگھ جاؤں گا، پھر یہ کسک، یہ ٹیس اور یہ گداز مندمل ہو جائے گا۔"

اور میں سوچنے لگی یہ کیا بات ہے۔ یہ ادیب اور شاعر گاؤں کی بھولی بھالی الھڑ دوشیزہ کو صرف تخیل کی دنیا میں اچھالتے ہیں اور جو زندگی میں آمنا سامنا ہو جائے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کیوں ——؟

ان مردوں کو اپنے سارے کارناموں کا الزام عورت کے سر تھوپنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ جب تک کلیجے پر بے وفائی کا زخم نہ لگے شاعری کی مدیرا نہیں چھلکتی۔ الہام صادر ہونے کے لئے لازم ہے کہ کوئی چک پھیریاں دے کر چھوڑ دے........ مگر اپنے مجاز کو تو یہ نسخہ الٹا پڑ گیا۔ شاید خوراک اندھا دھند بلتے وقت ہاتھ بہک گیا اور مقدار کچھ زیادہ ہو گئی۔ اب حکیموں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ کوئی نہایت ملیٹن سنی معجون اللہ شافی کھہ کر دیجائے تو یقیناً شاعری کی مرجھائی ہوئی کونپل میں جان پڑ جائے گی۔ اور میں نے دعا مانگی کہ خدا کرے یہ گاؤں کی نئی نویلی دُلھن جلد ہی داؤں پیچ سیکھ جائے اور مجروح کے دل کو دو چار ایسے اڑنگے لگائے کہ ایک بار واقعی غمِ جاناں" پھیل کر "غمِ دوراں" ہو جائے۔

بھوپال کے اسٹیشن پر لوگ استقبال کو موجود تھے۔ میں اور شاہد جان نثار اختر کے یہاں پہنچا دیے گئے۔ عادل رشید اپنی سسرال چلے گئے اور کرشن چندر اور مہندر وغیرہ کو اختر سعید لے گئے۔ اس چھوٹے سے سفر کے بعد ہی یہ بٹوارا کچھ شاق گذرا۔

جاں نثار اختر کے گھر پہنچے تو زینہ ہی پر میں اور صفیہ ایسے بھدّے پن سے گلے ملے کہ نیچے لڑ گئے لڑکے بچے۔ اوپر پہونچ کر ایک دوسرے کے بچوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ صفیہ نے کہا "میری بچی ہم دونوں سے اچھی ہے"۔ اور میں نے کہا "اس کے بچے اُن دونوں سے اچھے ہیں" اور پھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک بہتر دنیا کی بنیاد ڈال رہے ہیں

ایک تندرست اور خوبصورت دنیا۔

ناشتہ کر کے صفیہ تو کسی کام سے کالج چلی گئی اور محمد سے کہہ گئی کہ جو کچھ جی چاہے پکواؤ اور کھاؤ اور مجھے خیال آیا کہ مجھے ابھی جھک مارنا ہے یعنی خطبۂ صدارت ۔۔۔ اُف میری جان نکل گئی۔ میری ہی بچی کیا کم تھی کہ اور صفیہ میری تربت پر اپنے دونوں چراغ روشن کر گئی۔

شکر ہے خطبۂ صدارت فسادات کے بارے میں تھا۔ ان تینوں پول نے مل کر میری ہستی کو کھنڈر بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کرشن چندر کا کہنا ہے کہ میں نے اس میں تلخ نوائی سے کام لیا ہے۔ ضرور لیا ہوگا اور بخدا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اُف یہ بچے!

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جاتے وقت میری اور صفیہ کی کسی نہایت ہی معمولی بات پر کھٹ پٹ ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے خمیر میں تیزابیت بہت ہے اور میں کہتی تھی کہ اُسے بناتے وقت فرشتوں نے مٹی کو بجائے سادہ پانی کے شہد اور دودھ میں گوندھ ڈالا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو احمق سمجھتے ہوئے منٹو ہال پہونچ گئے۔ ہال کے ایک کونے میں پردے کا انتظام تھا۔ مردانے میں بھیڑ کم تھی، مگر زنانخانے میں کافی گھماگھمی تھی ہال بڑا تھا اور مائیکروفون کچھ عجیب ڈھیٹ قسم کا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور لڑکیاں ردہانسی ہو کر اس کونے سے اُس کونے تک اس امید میں دوڑ رہی تھیں کہ شاید ایک آدھ لفظ لپک سکیں۔ جب ناامید ہو گئیں تو خالص عورتوں کے انداز میں بیٹھ کر ترقی پسند مصنفین کی ناکوں اور مونچھوں پر ناقدانہ

بحث مباحثہ کرنے لگیں لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم سے مائیکرو فون جاگ اٹھا۔ جوں ہی کرشن چندر نے خطبۂ صدارت شروع کیا۔ ان کی آواز صاف آنے لگی۔ اس پر میں نے اور صفیہ نے ایک بوگس قسم کا لطیفہ ایک دوسرے کے کان میں پھونکا۔

خطبۂ صدارت پسند کیا گیا۔ نہ صرف اپنے موضوع کی بنا پر بلکہ کرشن کی اس شاعری کے بل بوتے پر جس پر ایک دفعہ علی سردار جعفری کو بھی اعتراض ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کرشن کا طرزِ تحریر نوخیز دلوں کو بڑا مسحور بنا دیتا ہے کرشن جوتا بھی مارتا ہے تو شاعری میں لپیٹ کر اور یہی وجہ ہے کہ ضرب گہری پڑتی ہے مگر نشان نہیں پڑتا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں تو جیسے کھڑ ونچے سے مارتی ہوں جن سے کھال چھل جاتی ہے۔ خطبۂ صدارت کا بھوت دانت نکوس کر مجھے ڈرانے لگا ہے۔ واپس آکر میں نے اس میں کے کئی ایک کلنٹے ذرا کھٹل کئے۔

کتنے دماغوں پر کرشن کو گرفت حاصل ہے۔ کچی ٹہنیاں اُس کی تحریر کی آندھیوں کے رُخ پر جھک رہی ہیں۔ کتنے معصوم دلوں میں تفکر کا بیج پڑ رہا ہے۔ نئے ایوانوں کی بنا ڈالی جا رہی ہے۔ اگر معمار کا ہاتھ لغزش کھا جائے تو........؟ قلم بھی تو رہنمائی کرتا ہے۔ کبھی کبھی کھٹکا بھی دیتا ہے یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں۔

دوسرے دن شاہد لطیف نے جلسہ کی صدارت کی۔ ظفر صاحب نے اپنا ایک ڈرامہ پڑھا، لیکن مائیکرو فون کا دماغ آج پھر ساتویں آسمان پر تھا

دوسرے ڈرامہ ذرا طویل تھا، تیسرے موصوف نے اُسے مقررہ وقت میں ختم کرنے کی غرض سے بے حد سرپٹ پڑھا۔ میں نے بھی کہانی پڑھی صرف ٹرائیل کے خیال سے کہ کہیں خطبۂ صدارت پڑھتے وقت ٹانگیں لرز کر گھگھی نہ بندھ جائے مگر اس قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ نہ ہی گھگھی بندھی نہ ہی ٹانگیں لرزیں۔ کتنے ہی حاجی ملنگ شریف ہم نے اپنی پیٹھ پر سوار کر رکھے ہیں۔ انھیں کب پٹخ چکیں گے۔ ابھی کتنے مرحلوں سے ہمیں اور گزرنا ہے۔ میں جو بڑی آزاد اور ترقی پسند بنتی ہوں، ان واہموں کے چنگل میں پھنسی بیٹھی ہوں تو پھر وہ جو پردے کے پیچھے دبکی بیٹھی ہیں، ان سے کیا کہہ سکتی ہوں۔

سندر لال جی کی صدارت میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کا اجلاس بڑا شاندار اور رعب داب کا رہا۔ انھیں مائیکروفون کی تو ضرورت نہ تھی۔ ہال کا کونہ کونہ اُن کی خطیبانہ للکار سے گونج رہا تھا۔ مجھے تو بس اس بات پر رشک آرہا تھا کہ وہ خطبۂ صدارت لکھنے کے بجائے بول رہے تھے۔ موضوع "اردو زبان کی حمایت" تھا۔ لیکن وہ تو چوکھی رسید کر رہے تھے۔ کبھی دو ہاتھ سیاست کے، کبھی اقتصادیات کے، کبھی ایک آدھ جھانپڑ مذہب کے بھی رسید کر دیتے تھے۔ پھر ہندو مسلمان دونوں کو بھگو بھگو کر رسید کیں۔ بیچ بیچ میں حسب موقع ایک آدھ اللہ میاں کے بھی چپکاتے جاتے تھے۔ پھر جیل خانوں اور ان کے مالکوں کی ٹانگ گھسیٹ ڈالی۔ دو چار ٹہنیاں اکھنڈ ہندی اور اردو کو بھی دے ڈالیں۔ سوائے کھانے پکانے اور سینے پرونے کے نسخوں کے دنیا کے ہر پہلو کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی تقریر سُن کر یہ تو یقین ہو گیا کہ

سندر لال جی مختلف زبانوں میں مختلف باتوں پر ایک ہی وقت میں ایک ہی روانی کے ساتھ تقریر کرنے کی حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں۔ مٹھاس اور کڑواہٹ نمکینی اور ترشی نہایت ہی موزوں اور نپی تلی مقدار میں شامل کئے جاتے ہیں۔ کہیں تو مریض کو پچھاڑ کر نسخہ میں اتارتے ہیں تو کہیں چپکے سے شکر میں لپیٹ کر کونین کی گولی کھلا دیتے ہیں۔ مگر پورا نسخہ کچھ بھاری پڑ جاتا ہے۔ کہیں کہیں لوگ بالکل کھوسے جاتے ہیں کہ نہ جانے کیا بے تکی سی ہانک رہے ہیں مگر جب انھوں نے پیشین گوئی کے طور پر کہا کہ ہندستان میں چین کی طرح انقلاب آئے گا اور ضرور آئے گا اور کوئی طاقت اُسے نہ روک سکے گی، تو کچھ لوگ چوکنے ہو بیٹھے لیکن سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو ہندستان سے مٹائے نہ مٹے گی جیسے انگریزی انگریزوں کی انتھک کوششوں کے باوجود ہندستان کی مادری زبان کو شکست نہ دے سکی۔ اسی طرح اکھنڈ ہندی اردو کو فنا نہ کر سکے گی۔ بلکہ ان دونوں زبانوں کے میل سے ہمیں ایک نئی زبان کو جنم دینا ہوگا اور وہ ہوگی "ہندستانی"۔

ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس کا درمیانی وقفہ میں نے عموماً زنانخانے میں گزارا۔ تین سال پہلے میں نے حیدرآباد کی طالبات کے درمیان بھی تھوڑا سا وقت گزارا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حیدرآباد کی لڑکیوں سے بھوپال کی لڑکیاں ایک قدم آگے بڑھ آئی ہیں۔ مثلاً حیدرآباد کی لڑکیوں نے پوچھا کہ محبت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور میں نے جواب دیا تھا کہ "محبت کے بارے میں قطعی ایکسپرٹ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی

مجھے محبت کا موجودہ طریقہ بھی اگر اس میں دیوداسیت ہو تو قطعی پسند نہیں۔ محبت ایک قسم کی ضرورت ہے، جیسے بھوک اور پیاس۔ اگر وہ صرف جنسی ضرورت ہے تو اسے بجھانے کے لئے گہرے کنوئیں کھودنا حماقت ہے۔ بہتی گنگا میں بھی ہونٹ تر کئے جا سکتے ہیں۔ رہا دوستی اور ہمخیالی کی بنا پر محبت کا دارو مدار تو اس ملک کی آب و ہوا اس کے لئے سازگار نہیں۔

بھوپال کی لڑکیوں نے مجھ سے زیادہ تر سوال پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق کوئی حل معلوم کرنا چاہا۔ دو چار نے اشتراکیت کے متعلق بھی چھوٹے چھوٹے سوال کئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگیوں میں رومان تو ہے مگر کچھ پھیکا سیٹھا۔ وہ اب بے باکی سے رومان لڑانے کے بجائے کچھ اور بھی کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کیا' یہ انھیں نہیں سوجھتا۔

اب جگہ تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔ خدا کی پناہ۔ یہ بھیڑ ہے یا میری آنکھوں کو ایک ایک کے چار نظر آ رہے ہیں۔ جدھر دیکھو انسانوں کے چہرے۔ آج زنانہ مجاز نے کو گھسیٹ کر بہت دور کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔ مائیکروفون ٹھپ پڑا تھا۔ مگر جاں نثار اختر منہ میں ٹھونسے دیتے تھے۔ چونکہ وہ اس کا کرایہ دے چکے تھے لہذا بقول کسی خان اپنا مال کھا ہی نہیں رہا تھا بلکہ دوسروں کو بھی کھلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مائیکروفون گلا دبوچ لیتا ہے ایک بار آواز کو نگل لیتا ہے اور پھر بڑھا کر اگلنے کے بجائے ڈکار جاتا ہے۔ ہال میں برابر کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ پردے کے پیچھے سے بیویاں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے پرچہ ختم ہوا۔

دوسرے اجلاس میں ڈرامہ تھا خاک پلّے نہیں پڑا۔ کسی کو اپنا پارٹ یاد نہ تھا۔ پرومپٹر کی آواز سب پر غالب تھی۔ ستم ظریفی دیکھیے۔ وہ لڑکے صاحب جو لڑکی کا پارٹ کر رہے تھے شیو کرنا بھول گئے تھے۔ چوٹی کسی احمق نے اتنی ڈھیلی لٹکائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹپکی اور جب ٹپکی۔ لڑکیاں تو بیچاری اسی ہول میں مری جا رہی تھیں کہ ڈراپ سین ہونے سے پہلے چوٹی ضرور ٹپک جائے گی۔ لیکن جب ڈرامہ بخیر وخوبی چوٹی سمیت انجام پا گیا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنی دیر جانو سولی پر لٹکے رہے۔

دوسرا لڑکا جس نے لڑکی بننے کی سعی بلیغ فرمائی تھی سینے پر اتنا گودڑ ٹھونس لایا تھا کہ لڑکیاں شرم اور غصے کے مارے بھنائی جا رہی تھیں۔ دو ایک نے آکر مجھ سے شکایت کی۔

"دیکھیے تو کیسا عورت کا ہیولیٰ بنا کر مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔"

میں پہلے ہی جلی بیٹھی تھی۔ جی چاہا مُنہ نوچ لوں کمبختوں کا میں نے کہا "یہی سزا ہے تم لوگوں کی۔ تم پردے میں بیٹھو اور جی بھر کر بیٹھو اور تمھارے بھوت بنا کر لوگ ایک دوسرے کو ڈرانے کے کام میں لائیں۔ جانتی ہو تمھاری اس پردہ داری نے کتنے دماغوں کو توڑ مروڑ کر الٹ دیا ہے۔ اور تمھیں تو مظلوم بننے کی عادت پڑ چکی ہے۔ مجھے اس قسم کی لڑکیوں سے کوئی ہمدردی نہیں جو خود اپنی مدد آپ کرنا نہ جانتی ہوں۔" میں نے عذر گناہ کے جواب میں کہا۔

لڑکیوں کے مُنہ اُتر گئے اور مجھے یاد آگیا صفیہ سچ کہتی ہے۔ میرے خمیر میں تیزابیت بہت زیادہ ہے جو صرف دُکھ پہنچا سکتی ہے۔ جو نرم و

نازک سطح کو کھرونچ ڈالتی ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا آج تو ضرور صفیہ کے قول کو جھٹلا دوںگی اور میں نے اپنے لہجہ میں تھوڑا سا شہد ملانا شروع کیا۔

"آپ ہی سوچئے آپ کے لئے مرد کیا کیا کریں۔ ہاتھ نہیں بٹا سکتیں تو کم سے کم اپنا بار ہی ان کے شانوں سے اٹھا لیجئے۔ مگر اس لکچر بازی میں میرا دل قطعی نہ لگا۔ ایک بات دیکھی میں نے اُن پردہ نشین لڑکیوں کی آنکھوں میں۔ ان میں لاچاری اور بے کسی کے ساتھ ساتھ اب ایک ہلکی سی رمق جھلاہٹ اور غصے کی بھی کبھی کبھی جھلکنے لگتی ہے۔ میں نے سوچا یہ زیادہ دن یہاں نہ رُک سکیں گی۔ کچھ تو ان میں ایسی ہیں جو منتظر ہیں کہ کوئی روشن خیال اللہ کا بندہ انھیں بیاہ کرلے جائے اور چوتھی بری کے جوڑوں کے ساتھ ساتھ منہ دکھائی میں انھیں آزادی بھی نذر کردے۔ پھر یہ اس آزادی کو لے کر مزے سے سینماؤں پارٹیوں میں گھوم سکیں گی۔ یہ مجھے باہر گھومتے پھرتے دیکھ کر رشک کر رہی ہیں۔ کچھ لڑکیوں کی آنکھوں میں تو میں نے حد سے زیادہ بے صبری دیکھی۔ وہ اپنی موجودہ فضا سے اتنی گھبرا گئی ہیں کہ اسے ہر قیمت پر چھوڑنے کو تیار ہیں اور وہ اس پہلے شخص کے ساتھ نکل بھاگیں گی جو انھیں یہ سب کچھ دینے کا وعدہ کرے۔

"بتائیے نا —— ہم کیا کریں" انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا

"میں اگر آپ سے کہوں آپ پردہ چھوڑ دیجئے، تعلیم حاصل کیجئے، نوکریاں کیجئے۔ تعلیم بالغان میں دلچسپی لیجئے وغیرہ وغیرہ تو مجھے معلوم ہے کہ اس میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ آپ پردے کی قید میں گرفتار ہیں۔ آپ کی بہنیں

جاہل ہیں۔ آپ کے ملک کے بچے بھوکے ہیں ننگے ہیں۔ نوجوان بے روزگار ہیں بیمار ہیں۔ یہ پردہ یہ جہالت یہ بھوک اور افلاس یہ سب ایک ہی پیڑ کے پھول پتے ہیں۔ یہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ آپ اگر ان پھول پتوں کو ایک بار نوچ بھی ڈالیں تو ان میں پھر نئے پتے پھوٹ آئیں گے جن میں اس سے زیادہ گھناؤنے پھل پھول کھلیں گے۔ اس لئے ہمیں جڑوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے۔"

"ہمیں ان جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے"، انھوں نے سوال کیا اور پھر میں سٹ پٹائی۔ یہ لڑکیاں میرا امتحان لے رہی ہیں اور مجھے تھرڈ نمبروں سے بھی پاس ہونے کے رونے پڑے ہیں اور ان کے اس چھوٹے سے سوال کا جواب بھی نہ دے سکی اور میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔ ہمارے پاس کوئی بھی ایسا پروگرام نہیں جسے ہم اپنے نوجوانوں کے سامنے پیش کرسکیں کوئی راستہ ایسا نہیں جس کی طرف اشارہ کرکے کہہ دیں "ادھر سیدھے چلے جاؤ"۔

"آپ لٹریچر پڑھیئے" میں نے چاہا اس وقت انھیں آسان سا نسخہ پکڑا دوں جسے یہ استعمال کریں۔ دوسری کوئی پیٹنٹ دوا تیار ہو ہی جائے گی حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لڑکیاں بھلا کیا پڑھ سکیں گی۔ یہ عمر یہ فضا یہ ماحول۔ یہاں تو بس قصّے کہانی اور ناولوں ہی کی کھپت ہو سکتی ہے اور پھر میرے خمیر کی تیز ابیت نے زور مارا۔ کل ہی تو کسی لڑکی نے مجھ سے کہا تھا یہاں زیادہ تر لڑکیاں رؤسا اور کھاتے پیتے لوگوں کی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ میں نے استری سدھار کا پرچار کیوں شروع کر دیا۔ سدھار میرا مقصد ہی نہیں

اس کھنڈر کی مرمت میں جان کھپانا حماقت ہے۔ اسے تو ڈھا کر نئے ایوان بنانے ہوں گے۔ بہت دن مرہم پٹی کر لی اب نشتر کی ضرورت ہے جو تیز بھی ہو اور پھرتیلا بھی، مگر میرے پاس لڑکیوں کی بات کا کچھ تو جواب ہونا چاہیئے میں نے سوچا۔ اس وقت باہر بھاگنا چاہیئے۔ باہر مردانے میں بڑے بڑے سورما بیٹھے ہیں شاید ان لڑکیوں کو جیت کرنے کا کوئی داؤں بتا دیں کرشن چندر سے پوچھوں گی وہ ضرور بتا دیں گے۔ جب باہر آئی تو کرشن چندر طلباء کے نرغے میں گھرے فرما رہے تھے:۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے لیکن وہی مشکل ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے اور کیسے باندھے۔"

میں نے کہا "تو بھئی مسیحا خود گرفتار بلا ہیں"۔

تیسرے دن مہندر ناتھ نے صدارت کی۔ ان کا خطبہ صدارت زنانخانے میں بڑے ہی انہماک سے سنا گیا۔ کیونکہ وہاں زیادہ تر نوجوان لڑکیاں تھیں۔ جو کچھ مہندر نے کہا اس سے بہت قریب تھیں، اور کرشن چندر اور شاہد لطیف کے خطبۂ صدارت سے زیادہ سمجھ رہی تھیں۔

جوں جوں شام ہوتی گئی مجمع بڑھتا گیا۔ آج عورتوں کو گھسیٹ کر بالکل اسٹیج کے قریب کر دیا گیا تھا۔ آج وہاں سے خوب صاف سنائی دے رہا تھا۔ بھوپال کے لوگ مشاعرے کے بہت زیادہ شوقین معلوم ہوتے ہیں خاص طور پر خواتین تو آج بہت آئی تھیں۔ پونے بارہ بجے مشاعرہ غزلوں اور

نظموں کے بل بوتے پر گھسٹتا رہا۔ ترقی پسند شعرا کی صف میں ایک تو مجروح تھے جو بطور تبرک کے وقتِ آخر کے لئے رکھ چھوڑے گئے تھے۔ جوش صاحب جو کہ بارہ بجے کی گاڑی سے لکھنؤ سے آ رہے تھے، آ ہی نہ چکے تھے۔ ایک تو مشاعرہ ویسے ہی کچھ سویا ہوا تھا۔ دوسرے میرے اور صفیہ کے بچے جاگ رہے تھے۔ سوائے حضرت تاباں کی نظم "دیوالی" کے اور کسی چیز کا لطف نہ اٹھا سکے۔ بھیڑ اور غل میں بچے بوکھلا بوکھلا کر ہم دونوں کا ناطقہ بند کئے دیتے تھے کہ اتنے میں شور ہوا "ہٹو بچو۔ جوش ملیح آبادی زندہ باد......

...... شاعرِ انقلاب زندہ باد.........." اور ہم نے دیکھا کہ شاعرِ انقلاب صفوں کو چیر کر اسٹیج کی طرف لائے جا رہے ہیں۔

جب جوش صاحب مسند پر براجمان ہو گئے تو صفیہ اختر نے اٹھ کر ایک چھوٹا سا سپاسنامہ پردہ نشین طالبات کی طرف سے جوش صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور ایک گوٹے کا ہار اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کے گلے میں آویزاں کیا۔ ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا اور ہمارے بچے دہل کر رونے لگے۔

اب کچھ اکھاڑہ جمتا نظر آیا، مجاز اور ساحر جن کی جوش صاحب کے ساتھ آنے کی اُمید تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ نہ آ سکے۔ ساحر کو تو بخار آ رہا تھا اور مجاز ...... ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی غیر حاضری کا تو اب ہمیں عادی ہو جانا چاہیئے۔ خیر! کچھ مجروح نے سنبھالا اور جوش صاحب تک مشاعرے کو پہنچا دیا۔ ایک تو لمبے سفر کی تکان، دوسرے کچھ ڈھلتی رات

جوش صاحب کچھ چڑے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی اور مشاعرہ ایک دم ختم ہو گیا۔

جب سے مصرع طرح کا فیشن اُٹھ گیا ہے شعرا نے مشاعروں میں نئی چیزیں پڑھنے کا فیشن بھی اٹھا دیا۔ سب وہی اپنی پرانی چیزیں اٹھا کر سنا دیتے ہیں۔ اس پورے مشاعرے میں سوائے تاباں کی "دیوالی" کے میں نے تو ہر چیز پہلے ہی سے سُن رکھی تھی، لہٰذا کچھ مزہ نہ آیا۔ یہ دیکھیے پھر تیز ابیت نے زور مارا۔

جاں نثار نے دوسرے کمرے میں جوش صاحب کو ٹھہرا دیا۔ اُن کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی تھے۔ صفیہ نے اپنے اور جاں نثار کے پلنگ اُٹھا کر ان دونوں کے لئے دوسرے کمرے میں لگوا دیے اور خود بچوں کو لے کر فرش پر سونے کا انتظام کر لیا۔ اس کا بس چلتا تو اپنے شوہر کے گرو دیو جوش صاحب کے لئے اپنی کھال بھی اُتار کر بچھا دیتی۔ آج وہ بے انتہا خوش تھی، اس کے گھر میں ہندستان کا سب سے بڑا شاعر جلوہ افروز تھا۔ اس جوش و خروش کے سلسلے میں کھانا پکوانا بھی بھول گئی۔ اب اس پر لرزہ چڑھا کہ اگر جوش صاحب کھانا مانگ بیٹھے تو کیا ہوگا؟ میں نے اس کو صلاح دی کہ صفیہ! جوش صاحب بڑے بھولے آدمی ہیں۔ اگر ان سے کوئی زور دے کر کہے کہ وہ کھانا کھا چکے ہیں تو وہ فوراً مان جائیں گے، لیکن جوش صاحب واقعی ریل میں کھانا کھا کر آئے تھے۔

صبح سویرے ہم لوگ سو ہی رہے تھے کہ پاس کے کمرے سے جوش صاحب

کے رباعیاں پڑھنے کی آواز آئی۔ صفیہ نے ہمیں جھنجھوڑ کر جگایا اور منہ پر چھپکا مار کے ہم اُن کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جوشؔ صاحب نہائے دھوئے صاف ستھرے کپڑوں میں شعر مجسّم معلوم ہو رہے تھے۔

یہ شاعر بھی عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ نئے شاعر۔ مجروحؔ قطعی شاعر نہیں لگتا، فرسٹ ایر کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ جعفری کا ناک نقشہ ان عربی و فارسی کے الفاظ سے کتنا دور نظر آتا ہے جو اس کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کیفیؔ کو دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ اسے ابھی گھڑے میں سے نکال کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور کوئی دم میں اُونگھ کر گر جائے گا لیکن جب وہ اپنے اشعار پڑھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس کا وجود ایک دبے ہوئے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اوپر آ رہا ہے۔ مجازؔ کو دیکھ کر یہ شبہہ بھی نہیں کہ یہ خون کی آندھیاں چلا سکتا ہے۔ لیکن جوشؔ صاحب زندگی میں بھی ویسے ہی چاق و چوبند اور گرجدار نظر آتے ہیں جیسے اپنی شاعری میں۔ اور اس وقت کچھ موڈ میں بھی تھے۔ گزشتہ شب کے مشاعرے سے کبیدہ خاطر نظر آ رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم سب نے اختر سعید کے ہاں کھایا۔ وہاں سے احسن علی ہم لوگوں کو اختر جمال کے ہاں لے گئے۔ اختر جمال بھوپال کی ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے ہیں جن کے والدین روشن خیال ہیں اور انھوں نے اپنی اولاد کو آزادی دے رکھی ہے۔ ہمیں یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ ان لڑکیوں نے اس آزادی کو استعمال کرنے کا کیا پروگرام بنایا ہے۔ وہاں سے ہم لوگ کاٹی کلب گئے جہاں مجلسِ استقبالیہ کی طرف سے ہم لوگوں کو ایٹ ہوم دیا گیا تھا۔

رات کو قریب کے کمرے سے جوشؔ صاحب کی صدارت میں منعقد ہونے والے گھریلو مشاعرے نے ہم لوگوں کو بھی کھینچ بلایا۔ جوشؔ صاحب بڑے موڈ میں تھے اور ڈانٹ ڈانٹ کر سب سے واہ واہ لے رہے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ جوشؔ صاحب کو ان کے اپنے اصلی رنگ روپ میں دیکھا۔ گزشتہ شب کے مشاعرے کی کڑواہٹ اب تک ان کے منہ میں تھی اور یونین کی طرف سے جو مشاعرہ ہونے والا تھا، اس میں قطعی شریک ہونے کو تیار نہ تھے، لیکن لوگ کہیں چھوٹنے والے تھے۔

دوسرے دن میں نے سوچا تھوڑی دیر کو حمیدہ سلام الدین کے ہاں ہو آؤں ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی۔ میں وہاں جاکر بیٹھی ہی تھی کہ اختر سعید صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ "سب لوگ سانچی جا رہے ہیں۔" میں نے کہا بھلا چار بجے سانچی جا رہے ہیں تو پھر لوٹیں گے کس وقت؟ کہنے لگے وقت کی کوئی پروا نہیں۔ سانچی جا رہے ہیں اور لوٹ ہی آئیں گے کبھی نہ کبھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ بھوپال آئے اور سانچی کے اسٹوپیں نہ دیکھے تو کچھ بھی نہ کیا۔ ویسے ہی ساری دکانیں بند ہیں۔ بٹوئے بھی ملنا مشکل ہیں۔

لیکن گھر آکر معلوم ہوا کہ جوشؔ صاحب لحاف اوڑھے قیلولہ فرمانے پر مصر لیٹے ہیں اور کسی طرح چلنے پر راضی نہیں ہوتے، صفیہ اور جان نثار جا نو بیٹی بیاہ کر اٹھے ہیں، لہٰذا تھکے ماندے پڑے ہیں۔ شاہد کو بھی نیند آرہی ہے لیکن کرشن چندر، مہندر ناتھ، عادل رشید اور رادھو کمار لاری میں ڈٹے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں ہم سانچی جاکر رہیں گے۔ اختر سعید، احسن علی بھی اُن کے

ہم نوا ہیں۔ جوش صاحب کے پاس دفد کے بعد وفد بھیجا جا رہا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ کرشن نے کہا ہم جوش صاحب کے بغیر جائیں گے اور لاری اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں عسکری صاحب اوپر سے چلائے "ٹھہر و ٹھہر و جوش صاحب اُٹھ رہے ہیں۔"

پندرہ منٹ گزر گئے۔

ہم لوگ پھر سمجھے کہ ہم جا رہے ہیں۔

اوپر سے آواز آئی "جوش صاحب واقعی اُٹھ بیٹھے"۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے۔

اب صبر کے پیمانے چھلک گئے مگر پھر کسی نے اطلاع دی "جوش صاحب زینے میں ہیں۔

پھر دس منٹ کا غوطہ!

اور جوش صاحب زینے میں۔

مگر اس سے قبل کہ پیمانے الٹ جاتے جوش صاحب مع تام جھام کے واقعی زینے میں آ گئے۔ مع جاں نثار اختر، صفیہ، عسکری اور شاہد کے دونوں سیٹوں کے بیچ میں ایک گدا ڈال کر ایک گاؤ تکیہ لگا دیا گیا اور شاعر انقلاب براجمان ہو گئے۔

ہم کسی معمولی لاری میں نہیں جا رہے تھے بلکہ ہسپتال سے ایک ایمبولنس مستعار لی گئی تھی۔ کم بخت اس قدر غل مچاتی کھڑکھڑاتی چلتی تھی کہ مُردے بھی جاگ پڑتے ہوں گے۔ تین چار میل گئے ہوں گے کہ اس نے

ہچکیاں لینا شروع کردیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مریضوں کی صحبت میں رہ کر کمبخت خود بھی ادھ مری ہوگئی تھی۔

"گھچ گھچ .... گھیچ" مریضہ بولی

"یہ گاڑی نہیں چلے گی صاحب" ڈرائیور نے نہایت ہی کھرّے پن سے کہا۔

"ہیں؟ چلے گی کیسے نہیں" اختر سعید نے ڈانٹا۔

ڈرائیور نے کوئی نہایت ہی مشینی قسم کا نام لے کر بتایا کہ وہ آلہ نہیں ہے اور پٹرول میں کچرا آرہا ہے، گاڑی رک گئی ہے۔

ڈرائیور کچھ اٹر پٹر کرنے لگا۔ سب نے اتر اتر کر اپنی کمر سیدھی کی۔ ایک ہی جھٹکے میں کمبخت جوڑ جوڑ ہل گئے تھے۔ صفیہ نے کہا "آج احسن علی کو کیا ہوگیا" اور ہم دونوں نے دیکھا کہ وہ کچھ عجیب رمانٹک انداز میں کھڑے ایک پیڑ کی بلندی ناپ رہے تھے۔ اتنے میں گاڑی ٹھیک ہوگئی اور چل پڑی۔ کوئی آدھ میل گئے ہوں گے کہ پھر وہی گھٹی گھٹی ہچکیاں۔ مگر اختر سعید اندر سے غرّائے اور گاڑی چلتی رہی۔ ادھر میں نے ڈرائیور کی صورت دیکھ کر کہا "صفیہ ڈرائیور کو کیا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے کے پیچ کیوں کستے جا رہے ہیں۔؟"

ملٹری کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بڑا غصہ آرہا ہے اسے"

ڈرائیور نے شاید ہماری کھسر پھسر سن لی۔ گاڑی پھر رک گئی۔ پھر کچرا۔ —— اور مجھے —— نیاز حیدر یاد آگئے "ہٹاؤ کچرا"۔

اختر سعید بھنّا کر اُترے ڈرائیور کو گھوڑا اور گاڑی کی میکینزم سمجھنے کی دھمکی دینے لگے۔ صفیہ نے مجھے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا "وہ دیکھو" اور میں نے دیکھا کہ احسن علی پھر پیڑوں کی بلندیاں ناپ رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے اس شخص کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔" صفیہ نے نبض بازوں کی طرح کہا۔

احسن کی آواز میں للکار ہے۔ الفاظ جی دار ہوتے ہیں۔ خیالات بے چین اور پھڑکتے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب احسن بولتا ہے تو نہ جانے کیوں علی سردار جعفری یاد آجاتا ہے۔

صفیہ اور میں سوچنے لگے کہ کیا بات ہے کہ عشق کرتے وقت سب پھر یکساں ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں اپنے مسلک اور اس کے طور طریقے بالکل یاد نہیں ہوتے۔ ایک شاعر، ایک ادیب ایک کمیونسٹ بھی جب عشق کرتا ہے تو آسمان ہی کی طرف تکتا ہے لیکن مزدور اور کسان جب عشق کرتا ہے تو تارے گنتا اور پھول سونگھ کر آہیں بھرتا ہے۔

"ارے کیوں بے چارے کے سر طوفان جوڑ رہی ہو۔ اس کے یہاں تو غم جاناں کبھی کا غم دوراں بن چکا ہے۔" صفیہ نے کہا۔

گاڑی پھر چل پڑی اور اب کے بڑی دھوم دھام سے چلی۔ شاید مریضوں کو دارِ فانی سے کوچ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ کیونکہ جب طوفانی رفتار سے ہم سب کو جھکولتی، کھڑکھڑاتی اور غل مچاتی جا رہی تھی۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کا آخر وقت آگیا ہے۔ بیچارے جوش صاحب گاؤ تکیہ دبوچے

اپنے جسم کو تولے بیٹھے تھے۔ اور سب بھی اپنا سر ایک دوسرے کے سر سے پھوٹ جانے کے ڈر سے بے چین سے نظر آرہے تھے۔

"جوش صاحب بڑے خوبصورت ہیں" میں نے چپکے سے صفیہ کے کان میں کہا۔

"ششش۔ چپ، کیا غضب کرتی ہو، جوش صاحب سُن لیں تو؟"

"میری بلا سے سن لیں.......... کیوں جی جوش صاحب اور ان کی برادری کے لوگ تو عورت کے حُسن کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملادیں اور ہماری جبین پر شکن بھی نہ پڑے۔ اور اگر میرے مُنہ سے جوش صاحب کے حسن سے مغلوب ہوکر دو بول نکل جائیں تو وہ بُرا ملنے کی دھمکی دیں۔"

"اف فوہ!............ کیا مصیبت ہے۔ تم سے بات کرو تو جھاڑ کا کانٹا اپنی جان کو لگالو........ بھئی یہ کچھ قابلِ تعریف بات نہیں سمجھی جاتی کہ عورتیں مرد کے حُسن پر لٹو ہوتی پھریں یہ

"تو پھر تمھاری رائے میں عورتوں کو ہاتھی گھوڑے کے حُسن پر لٹو ہونا چاہیئے مجھے قطعی تمھاری بات سے اتفاق نہیں۔ عورت کو مرد کے حسن کی تعریف کرنے کا پورا پورا حق ہے اور اب تو مجھ سے کرشن چندر نے بھی کہا ہے کہ ایک افسانہ یا مقالہ مردوں کے حُسن پر لکھوں اور دیکھ لینا میں اسے پہلی فرصت میں لکھوں گی..... میں اس میں مرد کی ناک کے بالوں کا لطیف ذکر چھیڑوں گی اس کی مونچھ کی نوک کو خنجر آبدار سے بھی زیادہ ہلاکت آفریں ثابت کروں گی

اور اس کی ڈاڑھی کو سانولی سلونی شاموں میں اُمنڈنے والی گھٹاؤں سے تشبیہہ دوں گی جس کی پہنائیوں میں عورت کا دل جنگلی کبوتر کی طرح پھنس کر پھڑپھڑاتا ہے اور جیسے ہزاروں اشعار عورتوں کی چولی اور اس کے بند اور تکمے کی شان میں کہے ہیں، اسی طرح میں مرد کے لنگوٹ اور ......"

"ہائے ہائے .... کم بخت ...... مرجاؤ .... موت آئے تمھیں۔" صفیہ نے زور سے میرا منہ مسل دیا اور سر سے پیر تک لرز اٹھی۔

"جب ہی تو لوگ تمھیں فحاش کا الزام دیتے ہیں ......"

ایمبلنس نے پھر ہچکیاں لیں اور ہم مردوں کے حسن کے نقطے سے پھسل کر منہ کے بل گرتے گرتے بچے۔

"صاحب موٹر اگر گئی تو واپس نہ لوٹ سکے گی۔ ویسے آپ کہتے ہیں تو چلنے کو تیار ہوں" ڈرائیور نے مودّب بننے کی کوشش کی۔ اگر وہ ذرا صاف گو ہوتا تو کہتا "احمقو! بھلا شام کے چھ بجے سابجی کے ٹوپ دیکھنے جا رہے ہو ستر میل کا سفر نہ ساتھ کھانا نہ پانی۔ میں تمھارا بھی خواہ ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ کیوں خواہ مخواہ وہاں جھک مارنے جا رہے ہو۔"

"کیوں! کیا پھر موٹر بگڑ گئی؟" اختر سعید غرائے۔

"بھئی واپس چلو" کرشن نے کہا "ڈرائیور کا دل نہیں کہتا جانے کو۔"

"مجال ہے اس اُلو کے پٹھے کی۔" اختر سعید جھلائے۔

ڈرائیور نے چہرے کے پینچ اور بھی کس لئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا تمھاری مرضی پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا میں قطعی ایسے پاگل وقت سانچی جانے کو تیار نہیں۔"

"ایسا ہے تو پھر واپس چلو بھئی" جاں نثار نے ڈرائیور کی معنی خیز خاموشی سے سہم کر کہا۔

"اب کے نہیں بگڑے گی" ڈرائیور نے شرارت سے مسکرا کر اطمینان دلایا۔

"ارے احسن علی کہاں گئے کسی نے یاد دلایا۔ بڑی مشکل سے موٹر کی اور واپس لوٹائی گئی۔ احسن صاحب ایک جیلی کی ٹہنی لئے سڑک پر کھڑے آسمان کو تک رہے تھے۔ سب بیچارے کو ڈانٹنے لگے، مگر وہ خاموش رہے سانچی جانے کا سارا موڈ ختم ہو گیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ بخیر و عافیت جلد از جلد گھر پہنچنا چاہیئے۔ تیس چالیس میل کا چکر لگا کر لوٹ آئے۔ یہ ہوئی سانچی کی سیر۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد آج پہلے دن ذرا صفیہ سے گپ شپ کا موقع ملا پر نہ جانے بازو کے کمرے میں لوگ کیا سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ہمارا جی نہ لگا۔ عجیب پر اسرار قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھسر پھسر اور پھر ایک طویل قہقہہ۔ میں نے اور صفیہ نے فیصلہ کیا کہ گیلری میں چپکے سے جا کر سنا جائے۔ اب ڈر یہ تھا کہ ہمارے بدتمیز بچے وہاں ساتھ جا کر ہمارے وجود کا اعلان کر دیں گے اور ہم پر ان قہقہوں کا بھید نہ کھل سکے گا۔ بڑی مشکل سے

اُن کم بختوں کو بہلا پھُسلا کر نوکر کے سپرد کیا اور خود گیلری میں دُب کر بیٹھ گئے گیلری میں پہنچ کر جو کچھ سُنا تو ہم پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے چند رکن سر جوڑے بالکل اس ہی موضوع پر اشعار سُنا رہے تھے جس پر ہمارے گھر کی کچی عمر کی بہو بیٹیاں چھٹو جان سے لطیفہ سنا کرتی تھیں۔

یہ چھٹو جان دلّی کی طوائف تھی۔ ہماری ممانی جان کی بڑی منہ چڑھی تھی اس اللہ کی بندی کو ایسے ایسے پرائیوٹ لطیفے یاد تھے عورت اور مرد کے پوشیدہ تعلقات پر مختلف من گھڑت قصے۔ جنسی زندگیوں کے متعلق سنسنی خیز لطیفے۔ اونچے گھرانے کی بھلی بے جان وہ جو لڑکیوں کے سر سے اگر دوپٹہ ڈھلک جائے تو سات سو طوفان جوڑنے لگیں۔ انھیں سُن سُن کر کلکاریاں مارتیں اور لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ نہ جانے کیوں ان باتوں کو سُن کر مجھے پنجاب کے ننگے جلوس یاد آ گئے، وہ سڑکوں پر زنا اور عورت کی بھیانک تخریب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جیسے دونوں ایک ہی جذبے کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں۔ پھر صفیہ نے مجھے بتایا کہ قریب تمام چوٹی کے شعرا کا اس قسم کا کلام پرائیوٹ اور بے تکلف موقعوں پر لطف اندوز ہونے کا بہترین نسخہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ مشغلہ گھر میں بیٹھنے والی ناکارہ عورتوں ہی تک محدود ہے۔ مرد تو سیاست اقتصادیات اور معاشیات پر بحث و مباحثہ کرتے ہوں گے۔ لوگ منٹو پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔ اگر کہیں وہ یہ سب کچھ لکھ دے تو اسے توپ دم کر دیا جائے۔ اور اگر میں وہ سب کچھ لکھ دوں جو معزز بیویاں چٹخارے لے لے کر سنتی اور سناتی ہیں، تو نہ جانے

لوگ میرا کیا حال کریں۔ مگر یہ سب باتیں خلوت میں ہوتی ہیں تو انھیں ادب کی ایک پرلطف شاخ سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی ان کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے منظر عام پر لے آئے تو لوگ پارسا بیویاں بن کر ناک سکیڑنے لگتے ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کے اشعار کا ایک بہت ضخیم خزانہ موجود ہے جو بالکل شاہی نسخوں کی طرح سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ بے چارے چرکین کا حشر دیکھنے کے بعد لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر شایع کیا گیا تو لوگ اُسے چورا ہے پر ڈال کر جوتیوں سے پیٹ کر ختم کر ڈالیں گے۔ لہذا بہتر ہے کہ اُسے ذہنیت کی پرورش کے لئے دماغوں تک ہی محدود رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ فن کیوں ظہور میں آیا۔ یہ تو میں کسی حالت میں بھی ماننے کو تیار نہیں کہ غم و غصہ، نفرت اور محبت کی طرح یہ جنسی درندگی بھی انسانی جبلت ہے۔ یقیناً یہ شاہی نظام کے تحفے ہیں۔ امرا اور روسا جب جسمانی عیاشی سے جس کی آخر کو ایک حد مقرر ہے اور تمام طلائیں اور گولیاں عاجز آجاتی تھیں تو وہ ذہنی بدکاری ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ بڑے درباروں میں اس قسم کے سامان ننگی تصویروں، کوک شاستروں، اشعار اور لطیفوں کی صورت میں فراہم کئے جاتے تھے جو اکتائی ہوئی زندگی میں تھوڑی سی جان پڑ جاتی تھی۔

پرانے کپڑوں اور چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ یہ نعمت مصاحبین کے گھر تک آئی اور وہاں سے ان کے مصاحبوں میں رینگ گئی اور اب ان کے تھوکے ہوئے نوالے ہمارا نقال طبقہ چباتا چلا آرہا ہے۔ لیکن اب وہ

لوگ جو انقلاب کے علمبردار بنتے ہیں۔ اس ذہنیت سے کس طرح سمجھوتہ کرتے ہیں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میرا دل بے طرح اداس ہو گیا۔ اُنھ چھوڑو ان باتوں کو جب سب کچھ بدل جائے گا تو ذہنیتیں خود بخود بدل جائیں گی۔ جڑ بدلنے کے بجائے پتوں کی کاٹ چھانٹ میں وقت گزارنا حماقت ہے۔ اس طبقے کے کیڑے مارنا فضول ہے۔ جڑ بدل گئی تو پھر نئی ٹہنیوں میں نئے پتے اور نئے پھول کھلیں گے۔

•

بمبئی آکر معلوم ہوا کہ علی سردار جعفری رہا ہو گئے، معلوم ہوتا ہے محکمۂ بالا سے کچھ گھپلا ہو گیا تھا یا شاید بھول چوک ہو گی۔

بھساول کے ترقی پسند مصنفین کو میرا پیغام ہے کہ آپکے کہنے کے مطابق ہم نے میدان رجعت پسندوں کے قبضہ میں نہ جانے دیا۔ بات یہ تھی کہ وہاں کوئی سامنے آیا ہی نہیں۔ لہذا میدان جیت آئے ہیں۔

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منہنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دیکر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو' اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشاں بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا، ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلّہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔

کبری کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلاکر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئیگا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو" اور مشکل آسان ہوجاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بناکر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبری کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے اُن کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبری کی ماں کے پراستقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں، لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہوگئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انھوں نے مسکراکر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسکا دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپاجھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پر دیئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبری کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے، ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی

ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے اُن لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سُرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اُٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ــــــ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا، ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔ یاد نہیں کب اِس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دُھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے جالے کا جوڑا کہکر سینت دیا جاتا، اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلھن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہونچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اُتر آئے گی، پر بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بُوا۔ لو اور سُنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں، اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنّا چھیڑ دیتی، کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا

اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بےچاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی اُلٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی، کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی اُلٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہ کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پہ بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ جوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشّاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکر وسے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آگئے۔ ابا کتنے دُبلے پتلے لمبے جیسے محرّم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اُٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا

اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اُتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اُسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح اُلجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر اُنھیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اُچھو کے دباؤ سے سُرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بےکسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی، اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقّے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔"

اور اب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی شادی سُن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اُس کے

سینے پر طوفان اُٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی، میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے۔ اور انھیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر بارات آن کھڑی ہوئی اور انھوں نے ابھی دلھن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو اُن کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ "بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبری پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبری نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہوگئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبری پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبری کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا" حمیدہ نے شرارت سے کہا

"نہیں" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی بالائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار، چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لبڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئیٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں

کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے" بی آپا کے پکّے مہاسوں کو دیکھکر انھیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکر ید کو کام آئے گی" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیّا ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا؟" بی اماں چڑھ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر ...." میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکا پڑیں چپکے سے بولیں،

"دیکھو ہنسنا نہیں نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک۔ دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خاص آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزہ کرکرہ ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور جو تھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیئے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی کھلی کے کباب کھا رہے ہو"، مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا، اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کمبخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتایئے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ" بی اماں نے ٹھوکا دیا
"آپ نے لا کر دیے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے"
"ارے واہ رے جگنی" بی اماں سے نہ رہا گیا۔
"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے"۔
"کھلی کے؟" "ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اُتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اُٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لیکر گئی تو بولے۔
"کہیے آج کیا لائی ہیں؟" "آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے"
"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔
"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری"۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر

بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمھارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے اُلجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ .... نہیں .... میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دئیے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہوگئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اُنھ،" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہوگئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورہ لے کر میری کلائی پکڑلی میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں ...... اوہ نہیں .... کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھُردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے

گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو...... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

اور کہہ رہے تھے "اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں"

"چل جھوٹی"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......"

"اری چپ مردار" انھوں نے میرا منہ بند کر دیا

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو"

"نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی، تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر اُن ہاتھوں

نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچاکر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔" میں نے سوچا میں آج سب

کچھ بتا دوں گی ۔

"کیوں ؟" وہ مسکرائیں ۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے .... دیکھیئے میری ساری چوڑیاں چور رہ ہوگئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا ۔

"بڑے شریر ہیں" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا ۔

"بی آپا..... سنو بی آپا ۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سلگ کر کہا "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی ۔"

"کیا ہوا ؟" بی اماں نے جا نماز بچھاتے ہوئے کہا ۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں ۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں ؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں ۔

"ہاں "

"خوب کیا ۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے ۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا ۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں ۔" پھر پچکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لیجو وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی ۔" یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی ۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا ۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے ۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے ۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں

نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سُنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیجدیں، کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اُسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے

کنوار پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی، دو پہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں۔ اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے اُنھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے

چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولھا کے منہ پر لمبا سا سہرہ پڑا ہے جو گھوڑے کی عیالوں کو چوم رہا ہے ....

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی بی آپا چلی آ رہی ہیں .... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی آپا کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے .... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں، ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذرّوں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے .... حمیدہ کا گلا بھر آیا ......

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے اُسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ .... یہ ملیدہ" اس نے اچھلتے ہوئے۔ دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا .... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو، اور پھر پہاڑ کھسکا .... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا ...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی ۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں ۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اُسے جلدی تھی ۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ پکے اور سویٹر نہ بُنے ۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ بیٹھی اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جا زم بچھائی گئی ۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں ۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا ۔ تحمّل کے بوجھ سے اُن کا چہرہ لرز رہا تھا ۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی ۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں ۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتہ کیا، اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں ۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے ۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں ۔ حمیدہ

ماضی کو دور جھٹک کران کے ساتھ جا لپی۔ لال ٹول پر .... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

کدھر جائیں؟

سچ کہا ہے کسی نے کہ دنیا فانی ہے۔ پرانی قدریں مٹتی ہیں اور نئی جنم لیتی ہیں۔ ادبی دنیا کی گاڑی بھی معلوم ہوتا ہے سینگ بدل رہی ہے، پرانے قلعے گر رہے ہیں اور نئے تعمیر ہو رہے ہیں۔ بھونچال آ رہے ہیں۔ سر بفلک عمارتیں زمین بوس ہوئی جا رہی ہیں، کچھ ڈگمگا رہی ہیں، کچھ سہارے ڈھونڈھ رہی ہیں، کچھ ملبے کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ایک تاریکی ہے، اُنجھاؤ ہے جس میں کچھ اندھوں کی طرح ہاتھ بہ بار رہے ہیں۔ کچھ ساحل کے کنارے سے لگے طوفان کے جھٹکے سہ رہے ہیں، یہ دیکھنا ہے کہ ان کے ہاتھ تھک کر ساحل کو چھوڑ دیتے ہیں یا ان کا عزم انھیں اس بھنور سے نکال کر پار لے جاتا ہے اس طرف جہاں منزل ہے۔

ایسی حالت میں صرف وہی ادیب کچھ کر سکتے ہیں جو اس طوفان سے تیر کر نکل چکے ہیں۔ اِس وقت اکثر ادیبوں کی حالت ایک ایسی کشتی کی سی ہے جیسے دو مختلف پتوار دو مختلف سمتوں کی طرف گھسیٹ رہے ہوں۔ خدا جانے کہ اس چھینا جھپٹی میں بے چاری کشتی کا بیڑا نکل جاتا ہے یا نیّا پار لگتی ہے۔

اس کشمکش کا نتیجہ تھا جو ساغر نظامی صاحب سے جھڑپ ہوگئی۔ پھر احمد عباس صاحب کا مقدمہ ہٹ گیا اور آج جوری کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر عبادت بریلوی سے الجھ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ کچھ لکھنے لکھانے کے بجائے اکھاڑے ہی میں عمر بیت جائے گی۔ مگر کوئی راہِ فرار بھی تو نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تنقیدوں کی صورت دیکھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔ بڑی بوجھل اور ثقیل معلوم ہوتی تھیں اور پھر ان میں دو چار بول اپنی تعریف میں دیکھ کر ناک سکوڑنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ لیکن کچھ دن سے تنقیدیں بڑی کڑوی بنتی جا رہی ہیں اور سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ کونین کی ان گولیوں کو زبردستی نگلا جائے یا ملیریا کو ٹائیفائڈ یا دق میں تبدیل ہونے کی دعوت دے کر اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

لہٰذا اب بڑی پابندی سے تنقیدیں پڑھی جاتی ہیں، کسی تفریحِ طبع کے لئے نہیں، دماغی طاعون سے بچنے کے لئے۔ تنقید نگاروں کو شاید احساس نہیں کہ ہماری لگامیں انھیں کے ہاتھ میں ہیں اور کیسے ہی اڑیل ہوں آہستہ آہستہ قابو میں آ ہی جاتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ کچھ ہنٹر بازی کے قائل ہوتے ہیں اور باتوں سے نہیں مانتے۔ بہت کم ایسے ہیں جو آزاد بچھیروں کی طرح "قلانچیں بھر جاتے ہیں"۔

لیکن عبادت صاحب کا تازہ مضمون نقوش میں پڑھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا فیصلہ کروں۔ جی میں آتا ہے قلانچ بھر جاؤں۔ پھر سوچتی ہوں ایک بار اور پوچھ لوں کہ میں کیا سمجھوں، سب سے پہلے تو وہ براہِ کرم اپنے اِس

پیراگراف کے معنی سمجھائیں:۔

"انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لئے کبھی بھی کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج بھی نہیں ہے آیندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر سیاسی خیال کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں، البتہ اس میں شریک ہونے کے لئے چند بنیادی باتوں پر اُن کا متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانیت کی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے۔ جبر و استبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو افراتفری مچا رکھی ہے۔ جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کو فنا کرنا ان کے نزدیک ازبس ضروری ہے۔ آزادیٔ تحریر و تقریر ان کے نزدیک انسان کا بنیادی حق ہے اگر ایسا نہ ہو تو انھیں اسکے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اگر حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کی چھاتی پر مونگ دلتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ ایسی حکومت کی مخالفت کریں۔ دنیا میں جو سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے جال پھیلا کر عوامی اور انسان دوست طاقتوں کو اسیر کرنا چاہتی ہیں، ان کے خلاف آواز اُٹھانی ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک لازمی ہے، وہ اپنے ملک میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مظاہرے نہیں چاہتے، وہ صحیح

منوں میں عوام کی حکومت کے خواہاں ہیں۔ عوام کی زندگی کو بلند کرنا ان کے پیش نظر ہے' ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کاٹ پیچ کی باتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں حالات کا صحیح جائزہ لے سکیں اور عوام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی اُن کے حق کا حصہ بن سکے۔ اگر ان بنیادی باتوں سے کوئی ادیب اتفاق رکھتا ہے تو وہ ترقی پسند ہے' وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فروعی باتوں میں اختلافات کے باوجود مختلف ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو سکتے ہیں' لیکن ان بنیادی باتوں پر ان سب کا متفق ہونا ضروری ہے جن کا بیان اوپر کیا جا چکا ہے۔"

معاف کیجیے گا جناب کلمہ تو پڑھاتے ہیں پھر کہتے ہیں مسلمان نہ ہو سب کچھ تو وہی کہا ہے جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ اس "مگر" کی تک بندیوں سے تو ہم عاجز آ چکے ہیں۔ یہ کمبخت لفظ تنقید نگاروں کو ایسا بھا گیا ہے کہ لگے ہاتھوں اس کا پھندا مارہی جاتے ہیں قبلہ یہ تو بتلایئے کہ سمندر میں کود پڑنے کے بعد وہ کون سی برساتی پوشاک پہنی جائے جو خشک رہ جائے۔

خود ہی تو کہتے ہیں کہ

"میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں"

نگران کو اشتراکیت کے بعض اصولوں سے اختلاف بھی ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایک دفعہ جی کڑا کرکے ان اختلافات کو واضح کرکے لوگوں کے سامنے پیش کردیا جائے۔ ویسے تو رڈ مین اور اٹلی بھی اشتراکیت کے ابتدائی دور کے قائل ہیں۔ ہمارے پنڈت جی کو بھی بس تھوڑے ہی "اختلافات" ہیں۔ ساغر نظامی اور احمد عباس صاحبان بھی اس مسئلے کے بیچ یہی فرماتے ہیں مگر اختلاف کے ساتھ۔ تو پھر وہ کیا بات ہے جسے لیکر آپ لوگ چھپا بیٹھے ہیں اور ہم بیچاروں کو نہیں بتاتے، آخر وہ کون سے اختلافات ہیں ہمیں بھی مطلع کیجئے تاکہ اگر کہیں غلطی ہے ان سے واقف نہ ہوئے ہوں تو اب ہو جائیں۔ ادیبوں کی جان پر بڑا احسان ہوگا ان "اگر" "مگر" گول مول جملوں سے ہمارے دلوں میں بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

عبادت صاحب سے میری التدعا ہے کہ براہ کرم برا نہ مانئے گا جیسے ہم نے آپ کی تنقیدوں کو سر آنکھوں پر لیا ہے۔ آپ بھی ہماری بات ٹھنڈے دل سے سننے کے لئے تیار ہوجائیے۔ کہیں یہ نہ سوچنے لگئے گا کہ یہ تنقید آپ پر کمیونسٹوں پر اعتراض کرنے کی وجہ سے کی جارہی ہے۔ لوگ آجکل بڑی جلدی بگڑ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا عبادت صاحب بتا سکتے ہیں کہ انھیں اور بہت سے دوسرے ادیبوں کو بہانگ دہل یہ یقین دلانے کی ضرورت کیوں پڑرہی ہے کہ ترقی پسند مصنفین سب کے سب کمیونسٹ نہیں۔ اور وہ خود بھی کمیونسٹ نہیں۔ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ آخر کیوں؟ میں کہتی ہوں کہ نہ ہونا بھی تو ضروری نہیں۔ آپ لوگ اس بات پر کیوں زور نہیں دیتے کہ اگر کوئی ترقی پسند

مصنف کمیونسٹ ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ میرے دل میں شبہ ہوتا ہے، اور خدارا اسے دور کیجیے، میں سوچتی ہوں کہ وہ کسی سے ڈر کر ایسا کہہ رہے ہیں اور کمیونسٹوں کے خلاف ایک بات کی بھی تشریح نہیں کرتے۔ ایک اختلاف کو بھی واضح نہیں کرتے۔ آخر کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ لوگ انجمن سے بھاگنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ آپ انھیں دلاسا دے رہے ہیں۔ وہ بدک رہے ہیں۔ آپ انھیں چمکار رہے ہیں، وہ ڈر رہے ہیں۔ آپ انھیں ثبوت دے رہے ہیں کہ "ڈرو نہیں کوئی ہوّا تمھیں نہیں کھا جائے گا"۔ آخر کمیونسٹوں کو یہ یقین دلانے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس ہوتی کہ انجمن میں رجعت پسند نہیں اور جو ہیں وہ تمھیں کاٹیں گے نہیں۔

عبادت صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ بڑے بڑے مختلف زبانوں کے ادیب ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے بدکتے ہیں۔ اگر ان کا ڈر نہ نکالا گیا تو وہ ہمیشہ جھجکتے رہیں گے۔ میرے خیال میں تو ان باتوں سے لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا خدشہ کبھی نہ نکلے گا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ انجمن میں زیادہ با اثر کمیونسٹ ہیں یا وہ جو صحیح معنی میں اشتراکیت پر ایمان رکھتے ہیں، مگر چند اختلافات کا فاصلہ ہے اب یہ فاصلہ جانے کب دور ہو جائے اور انجمن کھلے بندوں اشتراکیوں کی ہو جائے۔ اشتراکی ہونا آجکل جرم ہے اُن کی طرح سوچنا بھی جرم ہو چکا ہے۔ اختلافات کی آڑ زیادہ دن نہ چل سکے گی، رہ گئی "انسان دوستی" کی ٹٹی یہ بھی کتنے دنوں کی۔ جب تک بند ڈبہ ہے کام چلتا ہے۔ جس دن کسی نے "انسان دوستی" کی تشریح کا سوال اٹھا دیا یوں کھل جائے گا، پھر کیا کریں گے؟

اب ایسے خیالات میں اُلجھے ہوئے لوگوں کو کب تک رسّی سے باندھ کر انجمن میں رکھا جائے گا۔ ایسی حالت میں جبکہ ترقی پسندوں کا پروگرام اشتراکیوں سے دن بہ دن اتنا قریب آتا جا رہا ہے، یہ کہہ دینے سے کام نہ چلے گا کہ "ہم ترقی پسند ہیں" "انسان دوست ہیں" "عوام کے ساتھی ہیں" "سرمایہ داری کے دشمن ہیں" "انقلاب کے علمبردار ہیں" "اشتراکیت کو سیاسی مشکلات کا واحد حل سمجھتے ہیں"..... "مگر "ہم تو" خالص ادیب" ہیں" اور کچھ نہیں۔

بھلا حکومت اور اس کی مشینری ان چکموں میں آنے والی رقم ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عوام کے دوست انسانیت کے حامی جاہے کچھ بھی ہوں انکے دشمن ہیں تو پھر کیا فائدہ لگی لپٹی کہنے سے، اور لگی لپٹی رہے گی بھی کتنے دن؟ تار تار تو ہوئی جا رہی ہے، اس قسم کے تنقیدی نعرے لکھنے والوں کو کتنا گڑبڑاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔

عبادت صاحب کا یہ کہنا بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی پسند انجمن میں ہر سیاسی پارٹی کے لوگ رہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خواہ وہ لیگی ہوں یا مہاسبھائی۔ نیشنل گارڈ ہوں یا آر۔ ایس۔ ایس والے اور فاشسٹ، سب کے لئے انجمن کی آغوش کھلی ہوئی ہے۔ مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ ایک شخص بیمار بھی ہو اور تندرست بھی۔ جھوٹا بھی ہو اور سچا بھی۔ الٹا بھی ہو اور سیدھا بھی ہو۔ آپ لاکھ بلائیں "ہر سیاسی پارٹی" کا فرد جس کا پروگرام جُدا ہے۔ وہ انجمن میں آنے ہی کیوں لگا۔ اگر انجمن میں لیگی اور کانگریسی سرکار کے گن نہ گائے جائیں تو اس

پارٹی کے لوگ کیوں جھک مارنے آئیں گے۔ فاشزم کے قصیدے نہ پڑھے جائیں تو اس انجمن سے کیا دلچسپی؟ آپ بیکار انھیں یقین دلا رہے ہیں کہ انجمن میں کمیونسٹ نہیں، وہ کمیونسٹوں سے نہیں ان قدروں سے ڈرتے ہیں جو انجمن کا سرمایہ ہیں۔ آج وہ کمیونسٹ کا بہانہ کر کے انجمن سے بھاگ رہے ہیں، کل وہ صاف صاف کہدیں گے کہ "بھئی یہاں تو فاشسٹوں کے گن نہیں گائے جاتے۔ کانگریس اور لیگی سرکار کے شکریے نہیں ادا کئے جاتے، ٹاٹا اور برلا کے مرثیے اور سہرے نہیں گائے جاتے ہم یہاں نہ آسکیں گے" پھر جناب انھیں کونسا بھلاوا دیں گے۔ کیا پھر ان قدروں اور اصولوں کو بھی ترک کرنے کا مشورہ دیں گے جن سے انھیں اختلاف ہے، اور جو انجمن کا ورثہ ہیں؟

رہ گیا نئی انجمن قائم کرنے کا سوال، تو اس کے قائم کرنے کے لئے ہم کو بہت نیچے گرنا پڑے گا۔ وہ تو قائم ہو کر رہے گی، کیونکہ اسے سرکاری مدد ملے گی اسکا انجام بھلے وہ ہو جس کی آپنے پیشین گوئی کی ہے۔ اب ہمارے تنقید نگار ذہن کو سچائی کے اظہار سے صاف کرنے کے بجائے اور دھندلا رہے ہیں۔ ادھر ہیں بوکھلائے دے رہے ہیں اس "غیر جانب داری" سے اب کام نہ چلے گا۔ یہ سمجھوتے اب نہ ہو سکیں گے۔ مجھے تو کچھ خدشہ ہوتا جارہا ہے کہ کہیں خدا نہ کرے عبادت صاحب بھی آہستہ آہستہ "انسان پارٹی" میں نہ کھسک جائیں۔

آگے چل کر عبادت صاحب کہتے ہیں "ایک ترقی پسند ادیب کی اشتراکیت ایک اشتراکی کارکن کی اشتراکیت سے مختلف ہے۔ یہ ادبی اشتراکیت کس چڑیا کا نام ہے۔ میں نے آج سے پہلے نہیں سنا تھا۔ براہِ کرم تشریح کیجئے۔ میں نے

تو آج تک کسی کتاب میں اس قسم کی اشتراکیت کے بارے میں نہ ہی پڑھا ہے نہ ہی کسی سے سُنا۔ اشتراکیت تو وہ ہی ہے جس پر اشتراکی عمل کرتے ہیں۔ براہ کرم عبادت صاحب یہ بھی بتایئں کہ سیاست گندی چیز کیوں ہے؟ بُرا نہ مانئے گا مجھے صاف گوئی کا مرض ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے سفید آقا طالبعلموں سے یہی کہا کرتے تھے کہ "سیاست سے دور رہنا چاہیئے" مگر اس وقت ہمارے کانگریسی رہنما کہا کرتے تھے "سیاست تمھاری زندگی ہے اور زندگی سے تو دور نہیں بھاگ سکتے"۔ قدرت کے کھیل دیکھیئے آج وہی رہنما کہتے ہیں "سیاست سے دور رہو' یہ تمھارے مطلب کی چیز نہیں"۔ آج عبادت صاحب بھی انھیں کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ جب ہم میں سے کوئی اپنا ساتھی اُٹھ کر ایک سیاہ قلب سیاہ کار گروہ کا قول دہرا دیتا ہے تو خون کھول جاتا ہے اور بڑی گھن آتی ہے۔ پرانے مُلّا بھی تو کہتے تھے :-

"قرآن شریف عوام کے سمجھنے کے لئے نہیں ہے"

اور پنڈت بھی دعویٰ کرتے تھے :-

"وید کے ٹھیکے دار صرف براہمن ہیں"

کس مزے سے عوام کو غچہ دے کر ان کتابوں کو مطلب پرستی اور کاروبار کے لئے استعمال کیا گیا، آج ہمارے رہنما اور حکام اور ان کے ہمنوا بھی یہ ہی چاہتے ہیں کہ ہم سیاست کو گندہ سمجھ کر روح اور قسمت کے تانے بانے میں پھنس جائیں۔ عبادت صاحب یا تو اس بات کا مفصل جواب دیں ورنہ مجھے ان کو بھی اس ہی صف میں بٹھا دینا پڑے گا۔ کم سے کم وہ اس بات کا اعتراف کریں اور بتائیں کہ وہ

کون سی طاقت ہے جو اُن سے یہ سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ علی عباس حسینی اور جواد زیدی کو تو وہ اعلانیہ ہمارے دشمن بتا رہے ہیں اس کا شکریہ! ہم چوکنے ہو چکے ہیں مگر وہ خود تو ہمارے درمیان ہیں۔ کیا اب ہمیں ان کے الفاظ بھی ناپ تول کر رکھنے ہوں گے۔ علی عباس حسینی اور جواد زیدی سے دو ہی قدم پیچھے تو وہ خود نظر آ رہے ہیں۔

عبادت صاحب کیا ہمیں احمق سمجھتے ہیں؟ کیا ہم سیاست کے معنی بھی نہیں سمجھتے۔ سیاست میں غرق ہونے کے لئے یہ لازمی تو نہیں کہ نعرے لگائے جائیں، جھنڈے اُٹھائے جائیں اور ٹریڈ یونین کا ممبر بنا جائے۔ قلم میں طاقت ہے تو بغیر سڑک پر جائے اسٹرائک کروا سکتے ہیں۔ ریلوں کے تو کیا حکومت کے پہیہ کو جام کر سکتے ہیں۔ لیکن فرق ہی کیا ہوا۔ ریل کا پہیہ چاہے تحریر سے جام ہوا یا ہاتھ کے کسی رگ و پٹھوں سے۔ بات تو وہی ہوئی۔ اس میں اتنے داؤں پیچ دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال ناک تو پکڑنا ہی ہے مگر بغیر ہاتھ کی مدد کے ہم صرف تحریر سے کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے قومی ارادے عمل کرنے والے ہاتھ کے محتاج رہیں گے ہی، لیکن ان کی تحریر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرائک کرنے والوں اور پہیہ جام کرنے والوں اور ٹریڈ یونین کے ممبروں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہاں بمبئی میں اور دوسرے مقامات پر انجمنوں میں بہت سے ادیب، ٹریڈ یونین کے ممبر بھی ہیں۔ ریلوے میں کام کرتے ہیں۔ اسٹرائک بھی کرتے ہیں۔ کیا عبادت صاحب کی رائے میں وہ ادیب جو خارجی حالات سے اثر لے کر اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں کچھ ان سے بالاتر ہیں۔ نہیں میرا یقین ہے

کہ وہ جو عملی کام انجام دے رہے ہیں وہ انقلاب کا ہراول دستہ ہیں۔ ہم خارجی قسم کے ادیب تو ان کے پیچھے پیچھے جملہ ساز و سامانِ حرب کی مانند ہیں، ہم تو صرف انکے فوٹوگرافر اور ایک حد تک راستہ صاف کہنے والوں میں سے ہیں۔ ہم ان سے بہت پیچھے اور بہت نیچے ہیں اور ہمارا مقام کسی بھی کلی بھُنڈنے اور لفاظی سے ان سے بلند نہ ہو سکے گا۔ صرف کھُوکھلی خود ستائی کے علاوہ اس میں اور کچھ نہیں۔

مگر عبادت صاحب توجیہ کہتے ہیں۔ عمل کو نیچے گرنے کے معنی دیتے ہیں اور تحریری تخلیقوں کا تام جھام اٹھا کر چلتے ہیں جو بغیر کسی قسم کا عملی حصہ لئے الگ تھلگ ایک قبہ میں بیٹھ کر ظہور میں لائی جاتی ہیں جو کچھ میں نے رام بلاس شرما سے سمجھا تھا وہ سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔ اب مجھے غصہ نہ آئے تو کیا ہو۔ عبادت صاحب ادیب کو ایک عام فرد سمجھتے ہوئے ہتک محسوس کرتے ہیں اسے عجوبہ بنا کر "بلندی پر چرخِ نیلی فام پر ستاروں سے بھی آگے آسمانوں سے بھی اونچا" لٹکائے دیر ہے ہیں۔ بخدا یہ آسمانوں سے اوپر خالی فضا کے تصور سے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔ ویسے بھی بیچارے ادیب کو یوں الٹا لٹکنے سے کیا فائدہ۔ پھر وہ زندگی کا مطالعہ کیسے بجا لائے گا۔ "انسان دوستی" اور "عوام کی بہتری کے جملہ فرائض اتنی دور سے کیسے بجا لائے گا۔ کہیں موصوف بیچارے کو چھوٹا موٹا پیغمبر تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ جو وحی کے ذریعے اس پر چودہ طبق روشن ہو جایا کریں گے۔ براہ کرم، یہ احمقانہ وہم ادیبوں کے دل میں نہ ٹھونسیئے۔ بڑی مشکل سے تو وہ خود کو انسان سمجھنے پہ تیار ہو پائے ہیں، آپ انھیں پھر معلق کیے دے رہے ہیں۔ میرا مطالعہ اور تجربہ تو کہتا ہے کہ ادیب بالکل ہو بہو انسان ہوتا ہے۔ اسکے بیوی بچے، میاں۔ ساس سسر، نند بھاوج

دوست دشمن سو فیصدی ٹھوس ...... ہوتے ہیں، اسے باقاعدہ اپنی روٹی کی فکر کرنی پڑتی ہے اور یہ فکر اسے بار بار اس ہی میدان کی طرف گھسیٹ لیجاتی ہے جس کا نام سیاست ہے جو بقول آپ کے گندی ہے، جسے وہ دھو پونچھ کر صاف کرنا چاہتا ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے تو بھی اس سے دور بھاگ کر زندہ نہیں رہ سکتا تو پھر ادب کی تخلیق کیسے کر سکے گا۔ "دال کا دانہ" لینے کے لئے اسے خواہ وہ کتنے ہی اونچے آسمان پر ہو کر نیچے آنا ہی پڑتا ہے۔ خدا بھلا کرے بیکاری اور مہنگائی کے معماروں کا۔ وہ بقول آپ کے اور بھی "نیچے" پھسلتا آ رہا ہے۔

میں ایک ادیب کو جانتی ہوں جسے اپنی تصانیف کے مواد کی خاطر مچھیروں میں جانا پڑتا ہے۔ اس کا کشمیر کے مرغزاروں میں طرارے بھرنے کا عادی دماغ سوکھی مچھلی کی بدبو سے مانوس ہو چکا ہے۔ وہ گندی چالوں، سڑتے محلّوں میں جاتا ہے، کبھی ٹرام یا مچھلی والیوں سے بھری ہوئی بس میں کبھی پیدل زمین ناپتا ہوا اس کا گھر قطعی تذبذب میں ہے جہاں وہ میلے کمروں میں ننگے بچے گود میں لئے ادب کی تخلیق کیا کرتا ہے۔ وہ بہت بلند پایہ ادیب ہے۔ اس میدان میں چوٹی پر کھڑا ہوا ہے۔ کوئی کتنی ہی کوشش کرے وہ اپنی پست جگہ چھوڑنے پر راضی نہ ہو گا۔ بات یہ ہے کہ عبادت صاحب کو پتہ نہیں کہ دنیا اوندھی ہو گی، اب آسمان نیچے اور زمین اوپر ہے۔

ویسے موصوف کی رائے کیا ہے؟ کیا ہم لوگ ناک پر رومال رکھ کر خارجی زندگی جا کر دیکھ آئیں اور تخیل کے بل بوتے پر ادب پیدا کرنا شروع کر دیں۔ انکو تجربہ نہیں۔ لاشعور اور نفسیات کے بارے میں تو اس طرح مطالعہ کر کے لکھا جا سکتا

ہے۔ خارجی مطالعہ کر کے جو ادب بھی سڑک کوٹنے والی۔ چرواہی اور مزدورنی
کے بارے میں پیدا ہوا ہے اس سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ موصوف اسے
پیدا ہونا کہہ لیں میں تو اسے اسقاط ہی سمجھوں گی اور وہ بھی پھوڑیا کا اس ادب
میں شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محنت کش
طبقہ کی تضحیک کی گئی ہے۔ اس سے وہی کام لیا گیا ہے جو ویشیا سے لیا جاتا
رہا ہے۔ مزدورنی کے بھیس میں بھی وہی اندر سبھا کی پری جھلکتی نظر آتی ہے۔ کبھی
کبھی محتاط ہو کر اسے چیتھڑوں اور غلاظت میں لپیٹنے کی کوشش کی گئی ہے مگر
وہاں بھی چولی انگیا کے آگے کچھ نہیں بدلا۔

کیا عبادت صاحب یہ نہیں مانتے کہ اگر ہم عوامی ادب پیدا کرنا چاہتے
ہیں تو ہمیں عوام سے قریب ہونا پڑے گا اگر نہیں تو براہ کرم تشریح کریں کیونکہ ہم تو
اس ہی "غلط فہمی" میں مبتلا ہیں لیکن اگر عوام کے قریب جانے کی اجازت دیتے
ہیں تو یہ بھی بتائیں کہ مندرجہ ذیل موقع پر حکمائے ادب کونسا نسخہ استعمال کرنے
کی ہدایت دیتے ہیں۔ ہم عوام کا مطالعہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں کوئی اسٹرائک
چل رہا ہے یا کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔ اب ہم تو وہاں مزے سے مطالعہ کر رہے ہیں
کہ لاٹھی اور گولی آن دھمکی اس وقت کیا سر پہ پیر رکھکر بھاگ نکلنا چاہیے؟ چلیے
یہ بھی سہی اور جو عین وقت پر گر پڑے اور پکڑے گئے تو کیا کریں گے۔ بھلا کون
یہ عذر مانے گا کہ ہم وہاں مطالعہ کی غرض سے آئے تھے۔ ثبوت ہی کیا دینگے؟
اور کیا ہم یہ ثبوت دینا پسند بھی کریں گے؟ کہ ہم عوام میں سے نہیں ہم تو آسمانی
مخلوق ہیں خیر مصلحتِ وقت سمجھکر یہ بھی جھیل گئے لیکن اگر احتساب کرنیوالوں

نے کہا کہ "یہاں کیا جھک مار رہے ہو۔ سرکاری حلقوں میں ایک سے ایک عظیم الشان ڈرنر چل رہا ہے وہاں جا کر کیوں نہیں مطالعہ کرتے" پتہ ہے اگر اسکا جواب صاف صاف دے دیا تو کیا حشر ہوگا۔ فوراً آپ کمیونسٹ بن جائیں گے۔

ڈاکٹر علیم نے بھی کانفرنس کے موقع پر بمبئی میں یہ ہی کہا تھا کہ "وہ ادیب جو قلم چھوڑ کر تلوار اٹھاتا ہے ادب سے غداری کرتا ہے" قبلہ عالم یہاں کسے کمبخت تلوار اٹھانے کا شوق ہے، مگر اپنے سر پر گرنے والی تلوار بھی تو دشمن کے ہاتھ سے ہم ہی کو چھین نی ہے۔ اگر ہم پر لاٹھی اور گولی برسے تو کیا ہم چپ چاپ سینہ تانے کھڑے رہیں؟ بتلایئے نا آخر کیا کریں؟ مجھے پتہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے کیا جواب دیا تھا کیونکہ میں میٹنگ میں دیر سے پہونچی تھی۔ اب عبادت صاحب ہی براہ کرم بتا دیں کوئی تیر بہ ہدف نسخہ جو وقت پڑنے پر تلوار کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

عبادت صاحب کی اس تنقید سے ان لوگوں کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا جو موریچوں پر لڑ رہے ہیں جو حکومت کے ہتھکنڈوں کا پہیہ جام کئے دے رہے ہیں جو ڈالر کے پہاڑ ڈھائے دے رہے ہیں اور فاشزم کے بیخ کنی کر رہے ہیں یا ان لوگوں سے انکا اور ترقی پسند مصنفین کا کوئی ناتہ نہیں۔ اگر نہیں تو پھر کھلے بندوں اعلان کیجیے۔ اب نعرے بازی کا وقت نہیں اب ہمیں ہر نعرے کی تشریح بھی کرنا ہوگی اپنے ہر قدم اور فعل کا حساب دینا ہوگا، ایک دوسرے سے اگر سوال مانگا جائے تو اسے الزام لگانا ذاتی پرخاش کی بنا پر حملہ کرنا یا پارٹی

بندی کی پالیسی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا برا ماننے سے بھی کام نہ چلے گا۔ دلائل سے قائل کرنا پڑے گا ورنہ صاف کہہ دیجئے!

" ابھی فضا سازگار نہیں ذرا آہستہ چلو راستے میں روڑے ہیں۔" مگر ساتھ ساتھ یہ بھی لکھئے گا کہ کس سال کس مہینے کس دن اور کون سی گھڑی فضا سازگار ہو جائے گی۔ یہ روڑے آپ سے آپ راستہ سے کھسک جائیں گے کہ انقلاب مزے مزے ٹہلتا ہوا چلا آئے گا اور اس مبارک گھڑی کے انتظار میں اتنے دن ہم آسمانوں سے بلند چرخ نیلی سے بھی آگے افیون کا انٹا نگل کر تارے گنتے رہیں کہ کچھ اور بھی کریں۔

لیکن اگر عبادت صاحب کی رائے ہے کہ بھئی ذرا گول مول پروگرام رکھو۔ تھوڑی لگی لپٹی کہو کہ ادیب برا نہ مان جائیں تو جناب مجھے ان برا ماننے والوں سے بڑی نفرت ہے۔ میری اماں سمجھایا کرتی تھیں "لڑکیوں کو بڑی بوڑھیوں کے سامنے پٹاپٹ نہ بولنا چاہیئے نہیں تو کوئی نہ تھولے گا۔ سدا کنواری بیٹھی رہیں گی"۔ کنوارے مر جانا منظور، بڑی بوڑھیوں کے نخرے بس کی بات نہیں۔ جو کوئی بھی انجمن میں شریک ہونے کے لئے شرطیں لگاتا ہے اسے ان شرطوں کا محاسبہ دینا ہوگا۔ اگر ان کی شرطیں احمقانہ ہوں گی تو ان کا پورا کرنا انجمن کا کام نہیں۔ آج ایک بہانہ کرتے ہیں کل سو بہانے کریں گے انجمن کب تک ان کے نخرے سہے گی اور کیوں؟ کیا مستقبل سے ہم اتنے نا امید ہو چکے ہیں؟ کیا ادب بانجھ ہو جائے گا؟ اور نئے ادیب پیدا ہی نہ ہونگے۔ جو ہم موجودہ ادیبوں کی خاطر انجمن کے منشور کو توڑ مروڑ کر نئی نئی پھلجھڑیاں لگائیں۔ ہمارے آج کے فیصلوں

ہے ہمارے ادب کا مستقبل وابستہ ہے۔ اسی پر ہماری آئندہ پالیسی کا انحصار ہے۔ اگر ہم نے فراخ دلی سے ان الجھنوں اور غلط فہمیوں کو نہ سلجھایا تو آئندہ ہمیں عجیب عجیب پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے نظریات جب تک واضح نہ ہوں ہماری تحریریں بھی جب تک گول مول رہیں گی اور ابھرنے والے نئے ادیب ان غلط فہمیوں کا شکار بن کر ادب کی صورت کو اور بھی مسخ کر دیں گے یہ مسئلہ اتنا سطحی نہیں جتنا عبادت صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے جس کی روشنی میں انجمن کے نئے منشور کا حلیہ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔

یوں تو ہم چاہیں تو ہر کام کو "انتہا پسندی" اور "قبل از وقت" کا روڑا اٹکا کر روک سکتے ہیں مگر ہمارا مقصد روڑے اٹکانا نہیں۔ راستہ کو صاف کرنا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج جسے "انتہا پسندی" کہا جا رہا ہے، کہیں ہمارا پروگرام ہی نہ ہو اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے پروگرام کا تعین کرنا ہوگا ورنہ ڈر ہے کہ ہم بھاگ کر کسی اور سمت چل پڑینگے۔ نہ جانے کس طرف!

کیڈل کورٹ

کچے چمڑے کی مختصر سی گدڑی، کچھ زنگھیائی کیلیں اور نعل، ایک آدھ ہتھوڑی رانپی، سُوا اور چند بکسوے۔ یہ ہے اس کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ چند پھٹے، اُدھڑے جوتے، ایک اُلجھی ہوئی گدڑی دو چار ٹین کے ڈبّے۔ یہ ہے اس کا گھر جس کا ٹھیک ڈاک کا پتہ ہے۔ کیڈل کورٹ کی موری سے ذرا بائیں طرف کو ایرانی ہوٹل کے سائبان کے نیچے جہاں اوپر سے پھینکے ہوئے کچرے اور پان کی پیکوں سے پوری طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس کا مکان، گھر، محل، حویلی جو بھی سمجھ لیجئے واقع ہے، یہی اس کا وطن ہے اور وہ یہیں کا باشندہ۔ نہ جانے کب سے رہتا ہے، اور کب تک رہے۔ اندازہ تو یہی کہتا ہے کہ صاحب لوگوں کے جوتوں پر پالش کرتے کرتے اسے اس نفع بخش پیشہ کو اختیار کرنے کا خیال آیا ہوگا اور یہ خیال جب تک آتا رہے گا جب تک کہ ایک دن اسی جگہ مجبوراً اس کی روح اس کے کڑوے کسیلے جسم سے دق ہو کر بھاگ نہ کھڑی ہوگی، اور پھر جب وہ حسبِ معمول گودڑ میں سے جہاں وہ روز سورج کے ساتھ ساتھ چھپ جاتا ہے، نکل کر

پرانے جوتوں کی قطار لگا کر خام چمڑے کی گڈی نہ کھولے گا تو وہ راہ گیروں کی ٹھوکروں سے بھی نہ جاگے گا ورنا کے پر کھڑا ہوا سپاہی اپنا فرض انجام دیتا رہے گا سڑک پر موٹریں دوڑتی رہیں گی۔ ہوٹل میں پیالیاں کھنکتی رہیں گی اور ساری جیتی جاگتی فضا میں وہ سویا پڑا رہے گا۔

پھر جب اس کی نیند کا بھرم کھلے گا تو کیڈل کورٹ کے باسی اور ہوٹل میں آنے جانے والے چہ میگوئیاں شروع کر دیں گے۔ کتّے اس کے سرد جسم کو سونگھیں گے اور مکھیاں بھنبھنائیں گی۔ سرکاری لاری آئے گی اور بحیثیت ایک شہری کے اسے اس کا حق سونپ دے گی۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ فی الحال تو وہ ہوٹل کھلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ اینٹوں کا مضحکہ خیز دریچہ سا بنا کر اس پر اوولٹین کے خالی ڈبے میں پانی چڑھا دیتا ہے۔ ہوٹل کے پاس رہتے ہیں اسے کتنے ہی فائدے ہیں۔ علاوہ بزنس کی فراوانی کے عمدہ کھانوں کی لذیذ خوشبو مفت ہاتھ آتی ہے اُبلی ہوئی چائے کی پتیوں کو بوری پر روزانہ حفاظت سے اگر سکھا لیا جائے تو با فراط چائے تیار کی جا سکتی ہے۔ گو یہ پتیاں اُبلنے کے بعد مسلنے پر ذرا سا ہی رنگ چھوڑتی ہیں کیونکہ ہوٹل والا خود ان کا پہلے ہی کئی کئی بار خون نچوڑ لیتا ہے جب پھینکتا ہے۔ گرم گرم میلا پانی پی کر وہ اطمینان سے اپنی دوکان سجانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ شاید جورٹ کی دُکانوں کے بڑے بڑے مالک بھی اتنا وقت سجانے میں نہیں صرف کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی احتیاط سے کچے چمڑے کی گڈی کھولتا ہے۔ ایک ایک ٹکڑے کو جانچتا پڑتالتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنی چندھی آنکھوں سے اُن ٹکڑوں پر کیا گھورا کرتا ہے۔ پھر سر ہلا کر انھیں درجہ بدرجہ ترتیب دیتا

جاتا ہے۔ پھر وہ زنگھیائی کیلوں کی ڈبیاں اور شیشیاں نکال کر دواؤں کی طرح
سجاتا ہے۔ نعل اور چمکیلی کیلیں بڑے حساب سے بچھاتا ہے۔ پھر پرانے جوتوں کی
قطار لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اس سجاوٹ میں وہ برابر ردو بدل کئے جاتا ہے حتی
کہ کوئی گاہک آکر اسے چونکا نہ دے۔ ایسی صورت پیدا ہوتے ہی وہ نہایت پھرتی
سے جوتے کی نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ پھر مزے لے لیکر ایک ماہر فن جراح
کی طرح وہ اس کا ایک ایک جوڑ ٹھونک بجا کر دیکھ لیتا ہے جیسے اسے عشق ہو ان
جوتوں سے۔ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے تو وہ بڑے پیار سے اسے الٹتا پلٹتا ہے پھر
گاہک کی طرف دیکھتا ہے گویا پوچھتا ہے۔ اب لائے ہو بیچارے کو، اب۔ اس میں جان
کہاں، خیر دیکھتا ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور پھر اوزار چل پڑتے ہیں۔ چھٹا پٹ سوا
چمڑے میں ڈبکیاں مارتا ہے، زنگھیائی کیلیں اپنی اپنی جگہ ڈھونڈھ کر گھس جاتی
ہیں اور ہتھوڑی کھٹا کھٹ معاملہ فٹ کر دیتی ہے۔ گاہک چرمر کرتا مسکراتا چل
دیتا ہے اور وہ پھر جوتوں کی قطار نئے سرے سے جاذب نظر انداز میں جمانے
لگتا ہے۔

کیڈل کورٹ کی موری کے دائیں جانب ایک گیرج ہے جس میں کسی
زمانے میں موٹر رہا کرتی تھی۔ پر اب وہ موٹر تو سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہے
اور اس کی جگہ پندرہ آدمیوں نے چھین لی ہے۔ بیس فٹ مربع جگہ میں پندرہ جی
نہ جانے کس آسن سے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یہ کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ گیرج

کا دروازہ اوپر سے ہمیشہ نیچے کھنچا رہتا ہے۔ صرف جھک کر جانے کا انتظام ہے اگر آپ کو شوق ہو تو کیڈل کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ جائیے تو آپ کو گیرج کے اندر بہت سے میلے پیر، کھلے گھٹنے اور برہنہ کندھے آپس میں گتھم گتھا نظر آئیں گے۔ یہ اعضاءِ جسم عورتوں کے بھی ہیں اور مردوں کے بھی۔ ماؤں کے بھی اور بہنوں کے بھی۔ بہوؤں کے بھی اور بیٹیوں کے بھی۔ پتہ نہیں وہاں کیا پکتا ہے اور کیا کھایا جاتا ہے۔ ابھکے ہوئے انسان کی بو ہمیشہ بھبکے دیا کرتی ہے۔

اور وہ موٹر جو کچھ دن پہلے گیرج میں شان سے رہا کرتی تھی اب سڑک کے کنارے منہ بسورا کرتی ہے، روز صبح باپ بھائی یا بیٹا گیرج کے ادھ کھلے پھاٹک میں سے گردن نہوڑا کر نکلتا ہے اور موٹر سے ذرا فاصلہ پر اپنے ذریعہ آمد کو چمکا دمکا کر آئینہ بنا لیتا ہے۔ رات کے چھوڑے ہوئے باسی پھول جھوٹے پتے اور ٹوٹے گلاس موری میں جھاڑ دیتا ہے اور اپنا کاسہ گدائی چلا کر روانہ ہو جاتا ہے۔

گیرج اور ہوٹل کے بیچ میں ایک پھاٹک ہے۔ یہ کیڈل کورٹ کا پھاٹک ہے جس کے کھمبے پر مالک مکان کا نام اور عمارت کا نام اور سالِ تعمیر کندہ ہے۔ یہ عمارت کیڈل کورٹ ہے۔ کورٹ کے معنی ہیں کچہری، جہاں مقدمہ اور چالان وغیرہ ہوتے ہیں، مگر یہاں ایسی کوئی حماقت نہیں ہوئی۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ نچلے ملے پر رہنے والے فلم اسٹار سے حکومت کو خاص قسم کی پرخاش ہو گئی ہے، اس فلم اسٹار کو آپ نہیں پہچانتے

چونکہ اس نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا پھر بھی فلم اسٹار ہے کیونکہ اسے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور فلمی دنیا کو اپنی حماقت پر رحم آئے گا اور وہ کسی فلم میں جلوہ افروز ہو کر رہے گا۔

اس کا ذریعۂ آمدنی اُمید داری ہے۔ وہ اسی امید پر جیتا ہے۔ ویسے اسے کسی نے کبھی بغیر گاڑی کے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مرغ زریں کی طرح ٹھمکتا ہیٹ کا چھجّہ موڑے ایک سے ایک عمدہ کار سے اترتا چڑھتا دیکھا جاتا ہے کتنی ہی فلمی پریاں اُسے ہیرو بنا چکی ہیں جس فلم کمپنی میں جاتا ہے وہاں کی ہیروئن کو لے اُڑتا ہے۔ وہ تنومند ہے، خوبرو ہے، اس کی پیشانی سے بے رحمی ٹپکتی ہے، پر مُنہ کنواریوں ایسا ہے۔ وہ نیلے پیلے اور سبز چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنتا ہے اور بالوں میں مصنوعی خم بنواتا ہے اور جب فلمی پریاں اس کے لئے کالے بازار سے وسکی کی بوتلیں لاتی ہیں تو انھیں خالی کرکے وہ اُن کے سروں پر پھوڑتا ہے اور جب وہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے باوجودیکہ وہ اس قدر جلاد قسم کا مرکھنا دیو ہے پھر بھی اس کے گرد ہمیشہ پریاں پھڑپھڑایا کرتی ہیں۔ شام پڑتے ہی اس کے یہاں گرد و نواح کے رنگین مزاج جمع ہو جاتے ہیں۔ آئے دن ناچ و رنگ کے جلسے رہتے ہیں کبھی کبھی وہ بڑے مقدس انداز میں ان پریوں سے شادی رچا لیتا ہے، پھر کچھ دن کے لئے کیڈل کورٹ کی نچلی منزل میں موت سی ہو جاتی ہے۔ سارے قہقہے چھپے ایک اُجاڑ قسم کی خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔

پھر اس کے بالوں کے خم ختم ہونے لگتے ہیں۔ سوٹ ماند پڑ جاتے ہیں اور نچلی منزل میں چھوٹے چھوٹے زلزلے آنے لگتے ہیں کیونکہ فوراً ہی کسی فلمی ہیروئن کو شدت

سے ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور وہ دوبارہ بالوں میں خم ڈلوا کر تلاش معاش میں جُت جاتا ہے اور پھر خالی بوتلیں سروں پر پھوٹتی ہیں۔ کیڈل کورٹ کے نوابیوں کی نیندیں اچٹتی ہیں۔ اور ایک دن بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچا کھچا مال سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی چہچہے شروع ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح یہ زندگی کی چرخی چلتی رہے گی، یہاں تک کہ ایک دن وہ سچ مچ ہیرو بن کر پردۂ سیمیں پر جلوہ افروز ہو جائے گا یا اسی امید میں اس کے گھنیرے بال عمر کی اندھیری وادیوں میں منتشر ہو جائیں گے اس کی کھنچی ہوئی بھنوئیں جھک جائیں گی اور چمکیلی آنکھیں گدلا جائیں گی۔ اس کے تنے ہوئے پٹھے جھول کھا جائیں گے چیتے جیسی کمر پھیل کر پھکنا بن جائے گی۔ اور پھر نہ ہی پریاں اس کے گرد منڈلائیں گی اور نہ سروں پر خالی وسکی کی بوتلیں پھڑوائیں گی۔ اور پھر وہ لُٹی کھٹی طوائف کی طرح.... .... نہ جانے کیا کرے گا۔ زندگی اسے پھٹی جوتی کی طرح گھسیٹتے گھسیٹتے ایک دم چھوڑ کر چل دے گی۔ اور پھر؟ پھر نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کا گھر کوئی دوسرا اُمیدوار لے لیگا اور امید کی شمع جلا کر دکان سجا دے گا۔

دو زینے طے کرنے کے بعد کیڈل کورٹ کا پہلا مالا ہے۔ یہاں ایک مرمٹی جوڑا رہتا ہے۔ چھوٹا سا خاندان۔ نوجوان میاں اور کمسن بیوی اور ننھا مُنّا سا ایک بیٹا اور ایک بوڑھی لڑاکا ماں۔ نوجوان کہیں پورٹ میں کلرکی کرتا ہے اور کمسن بیوی کسی لوکل اسکول میں معلمہ ہے۔ دونوں کی مجموعی کمائی ایک سو دس روپیہ ہے نوجوان گریجویٹ ہے اور اس کی بیوی مٹرک پاس۔ اور یہ دونوں ملکر ایک سو دس روپیہ ماہوار کما لیتے ہیں۔ بیالیس روپیہ مکان کا کرایہ باقی اڑسٹھ روپے

ہیں کالے بازار سے گیلے کوئلے اور کرکری شکر کے علاوہ چار جانوں کا کھانا پینا، سیر تفریح سب کچھ ہو جاتی ہے۔

جب ہندستان آزاد نہ تھا تب بھی یہ خاندان یہیں رہتا تھا۔ جب یہاں ایک باپ بھی رہتا تھا۔ یہ گھر ہمیشہ مشہور لیڈروں کی تصاویر سے آراستہ پیراستہ رہا کرتا۔ اور جب ہندستان آزاد ہو گیا تو سب سے زیادہ روشنی اور جھنڈیاں انھیں کی بالکنی میں لگی تھیں، گھر کے دروازے پر، سیڑھیوں پر اور تصویر کے چوکھٹے میں فریم کیا ہوا "جے ہند" نہایت روشن اور منور ہے۔ کمرے کی سب سے بڑی دیوار پر سوبھاس بابو کی سیلوٹ کرتی تصویر ہے۔ اس کے اوپر کچے سوت کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گئے سال کا ذکر ہے۔ اس سال ۱۵ اگست کو ان کی بالکنی میں جھنڈوں کی تعداد سکڑ گئی تھی اور دیئے دو چار ہی گھنٹے ٹمٹما کر رہ گئے اور دیوار پر لکھا ہوا "جے ہند" ماند پڑتا جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۵ اگست کو جب آزادی آئی تو گورنمنٹ نے کنٹرول نہیں کیا اس لئے ساری آزادی بلیک مارکٹ میں دھر لی گئی جس کا جی چاہے آزادی لے آئے۔ پر ذرا مشکل سے ملتی ہے کیونکہ وہی بات ہے کہ مانگ زیادہ ہے اور سپلائی کم۔ آزادی کوئی ایسی ویسی چیز تو تھی نہیں کہ دھوپ اور ہوا کی طرح ہر ایک ایرے غیرے نتھو خیرے کو بانٹ دی جاتی، نہایت احتیاط سے سینت کر رکھی گئی ہے۔ وقتِ ضرورت بانٹ دی جائے گی۔

اور اسی بٹوارے کی آس لگائے یہ جوڑا زندگی کا قرض اتارتا چلا جا رہا ہے۔ یوں ہی "جے ہند" اور قومی لیڈروں کے سائے میں کمر جھکائے ایک سو دس

روپئے میں گھر کی آگ سلگتی رہے گی۔ یوں ہی نوجوان یہاں سے فورٹ اور فورٹ سے گھر آدا گون میں جتا رہے گا اور کمسن بیوی، دوپہر کے وقفے میں ننھے کو دودھ پلانے ہانپتی دوڑتی آتی رہے گی۔

پھر ایک دن یہ نوجوان اپنی جگہ منے کو سونپ کر چل دیگا اور وہ ننھا جوان ہو کر اور بھی بڑے بڑے لیڈروں کی تصویروں سے کمرے کو سجائے گا اور سیڑھیوں پر لکھا ہوا "جے ہند" نئے رنگ سے جگمگا اٹھے گا، پھر ایک سو دس روپے آئیں گے اور گیلے کوئلوں اور کرکری شکر کے بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

دو زینے اور چڑھیئے یعنی زمین سے چار زینوں کی اونچائی پر ایک نہایت اعلیٰ خاندان کی اصلی جیتی جاگتی فلم اسٹار سکونت پذیر ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ یہ میل جول اس زمانے کی یادگار ہے جب میں نے بمبئی پر پورے طور سے قدم نہ ڈالے تھے اور ہر فلم اسٹار کو جیتا جاگتا دیکھ کر چیخیں نکل جاتی تھیں۔ عرصے سے ہم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شرکت کرتے آئے ہیں۔ راضی خوشی نہ سہی کم از کم مجھے تو اس کے سارے غموں میں شرکت کرنا ہی پڑتی ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں اچھی خاصی انسان معلوم ہوتی ہے مگر ایک نہایت ہی مکروہ لت اس کو چمٹ گئی ہے۔ وہ ہے عشق بازی وہ تعلیم یافتہ تہذیب ہے لہٰذا اس کے عشاق میں عموماً شعرا ادیب اور جرنلسٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ میری سہیلی کا کہنا ہے پتہ نہیں کہاں تک درست ہے کہ وہ سب کے سب اس کے عشق میں گرفتار ہیں یا گرفتار تھے، یا گرفتار ہونے کے آرزومند ہیں۔ پتہ نہیں

اُسے یہ شبہہ کیوں ہوگیا ہے کہ میں عشق کے معاملے میں ایکسپرٹ ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ تازہ واردات کے موقع پر مجھی سے رائے لیتی ہے۔ جہاں اس کے تازہ عاشق سے چشمک چلی جو کہ ضرور چلتی ہے۔ چونکہ وہ عشق صرف لڑنے روٹھنے اور ملنے کے لئے کرتی ہے تو میرا دم سوکھ جاتا ہے۔ آئے دن میری جان پر مقدمے دائر ہونے لگتے ہیں۔ اور تو اور اُسے عشق کے جملہ مراحل طے کرنے کے لئے میرا ہی گھر موزوں نظر آتا ہے۔ میرے ہی صوفوں پر روٹھے منتے ہیں۔ میرے ہی گلدانوں سے ایک دوسرے کے سر پھٹتے ہیں اور بعض زمانے میں تو مجھے خود اپنے کمروں میں باقاعدہ کھنکھار کر، ہوک بجا کر جانا پڑتا ہے۔ کتنی بار جی چاہا کہہ دوں منجھو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمھارے یہ دکھڑے سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ کیا میں ایسی بے مصرف ہوں کہ سوائے تم جیسی ناکارہ چیز کے اور کوئی الجھن میری زندگی میں نہیں میں بیٹھ کر تمھارے عاشقوں کے دکھڑے سنوں یا سوچوں کہ اناج کتنا کم ملتا ہے راشن پر چاول تو جیسے بونے سے پہلے بیج سڑ گیا تھا" جب سے کنٹرول کھسکا ہے آنکھیں لٹھے ململ کو ترس گئی ہیں۔ کہتے ہیں کفن کا کوٹہ ملتا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے وہ کفن والا لٹھا مل جائے، تو ایک غرارہ مزے سے بن جائے۔ پھر شکر میں کتنی دھول ہوتی ہے۔ جانو گنے ہی کر کرے بوئے جانے لگے۔ پر تم کیا جانو ان باتوں کو۔ یہ جو عاشقوں کا چسکا بیٹھے بٹھلائے جان کو لگا بیٹھی ہو کہ سال کے بارہ مہینے بس ان ہی کی جان کا رونا کہ اب کون سی فصل آئی۔ کون سے کاٹے جائیں اور کون سے تازہ بوئے جائیں۔ کن کی ادھیڑ بُن کی جائے اور کون سے جھاڑ پونچھ نیفتھلین کی گولیاں ڈال کر اسٹور کر دیئے جائیں کہ وقتِ ضرورت کام آسکیں۔

اور پھر میرا جی بول اٹھتا ہے اور موچی کی خام چمڑے اور پرانے جوتوں والی دکان آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مجھے اس کے عاشق جوتوں کی ایک طویل قطار کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اونچی ایڑی کے، نیچی ایڑی کے، بغیر ایڑی کے ولایتی، ہندستانی سینڈل اور واکنگ شو، ڈانسنگ شو، اور پلیٹ فارم شو، روپہلے چمکیلے اور پھٹے ہوئے چپٹے اور گھٹیلے، پر کوئی بھی تو ان میں سے فٹ نہیں۔ کسی کا پنجہ کاٹتا ہے تو کوئی ایڑی پر چھالا ڈالتا ہے۔ کسی کا تسمہ ڈھیلا تو کسی کا بکسوا تنگ۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ مزے سے پیر میں ڈال کر زندگی کی پگڈنڈی پر ٹھمکتی لچکتی چلی جاؤں۔

ان کے تازہ ترین عاشق سے میرا پرانا بیر ہے۔ وہ ایک عرصے سے مجھ سے ایک فلمی کہانی لکھوانا چاہتا ہے اور اتنے بھاؤ تاؤ کر رہا ہے کوئی دم میں کم ہونا چاہتی ہے اور وہ بھی سمجھ گیا ہے کہ کچھ دن بعد میں اس کی مرضی کے مطابق داموں پر لکھنے پر مجبور ہو جاؤں گی، پھر اس میں وہ جملہ رد و بدل کر کے اپنی بوڑھی داشتہ کو میرے تخیل کی پندرہ سالہ چھوکری بنا دے گا اور پھل پھل کرتے دُنبے جیسے ہیرو کو جو حاملہ عورت کی طرح پھیل پھیل کر چلتا ہے اور جس کے سینے پر اتنا گوشت ہے کہ با آسانی ۳۲ نمبر کی بریزر پہن سکتا ہے۔ جواں سال ہیرو کا پارٹ دے دیگا۔ پھر جب یہ بوڑھی گھوڑی اور ڈھیلا ہاتھی، پھدک پھدک کر باغوں میں دوگانے گائیں گے۔ میرا سر شرم سے نیچا ہو جائے گا۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گی کہ یہ کہانی میں نے تخلیق کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ کہانی مہنگے کوئلوں بھیگی شکر اور کمیاب لٹھے نے اس کو سوچی تھی۔ کالے بازار سے لٹھا اور ململ خریدوں گی اور بھیگے کوئلے کہ اس کی آنچ سلگتی رہے اور پھر مجھے کہانی لکھنے کا معاوضہ ملے۔ ایک عجیب و غریب جگہ ہے جس میں فلم ڈائرکٹر اور کالا بازار ایک دوسرے کی

دم پکڑے چک پھیریاں لے رہے ہیں۔ میں فلم ڈائریکٹر کو اور فلم ڈائریکٹر کالے بازار کو اور کالا بازار مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس چکر میں مجھے کتنی متلیاں آئی ہیں! ــــــ خالی متلیاں، پھل ندارد! اور یہ متلیاں یوں ہی آتی رہیں گی، یہاں تک کہ فلم اسٹار کے چھدرے بال جھڑ جائیں گے۔ چہرہ ناقابلِ مرمت ہو جائیگا اور وہ اپنے عاشقوں میں کسی ایک کے حق میں قرعہ ڈال دے گی اور اس کے گھر میں بیٹھ کر موٹی نہ ہونے کی فکروں میں پڑی پھولا کرے گی اور ایک دن فلمی کہانی لکھتے لکھتے میں اپنا قلم چبا کر نگل جاؤں گی اور ان گیلے کوئلوں کو اتنا پھونکوں گی کہ وہ بھڑک اٹھیں گے۔

اگر آپ کی ٹانگیں شل نہ ہو گئی ہوں تو دو زینے اور طے کر ڈالئے۔ یہ کیڈل کورٹ کا تیسرا مالا ہے۔ اگر آپ دروازے پر دستک دیں تو ایک اجاڑ صورت مریض دروازہ کھول کر جھانکے گا اور سہم کر آپ سے درخواست کریگا کہ بھائی غُل کیوں مچا رہے ہو۔ خواہ غل، بالکل نہ مچ رہا ہو۔ یہ بیچارہ ایک مزدور پیشہ آدمی ہے۔ یہ جو آپ کو سمندر کے کنارے چاٹ پکوڑی کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ یہ قریب قریب نصف اسی کی ہیں جنھیں اس نے ٹھیکہ پر دے رکھا ہے وہ نہایت ذلیل درجے کے ٹھاٹ ہیں اور بہت کم منافع لاتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ میرین لائن پر اس کی ایک قطار میں تین عمارتیں ہیں۔ باندرا میں دو بنگلے ہیں، ایک تو غریب نے اپنے ذاتی مصرف کے لیے بنوایا تھا۔ تمام ایرکنڈیشن کرایا مگر پھر ہٹ دنار ہتیوں پر و یا کھا کر صرف پچیس ہزار پگڑی لے کر دیدیا۔ بیچارہ بلڈنگ اپنے لئے بناتا ہے لوگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اس بوسیدہ عمارت میں رہتا ہے۔ اب تو یہ حال ہے

کہ مکان کی ینو پڑی اور پگڑیاں ٹپکیں۔ کرے بھی تو کیا؟ لوگ چھوڑتے ہی نہیں۔ اب وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو پگڑی پر دے کر فٹ پاتھ پر موچی کے شانے سے شانہ ملا کر پڑ جائے گا۔ دنیا اسے سرمایہ دار سمجھتی ہے حالانکہ اس کی روح تک ننگی بچی ہے۔ اس کا سارا روپیہ کاروبار میں پھنسا ہوا پھولتا جا رہا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر کپڑے کی اس کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی دُکانیں ہیں، یہاں رول سے پورے تھان لا کر ان کے کٹ پیس بنا کر کالے بازار کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ فٹ پاتھ پر سارے بمبئی میں کالا بازار پڑا جگمگاتا ہے۔ مگر اسے نہ پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے، نہ ہمارے دیس کے مقدس لیڈر، جیسے وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہو۔

دو زینے اور گھسیٹ ڈالئے۔ ابھی ٹانگوں میں ویسے دم تو نہ رہا ہو گا۔ یہ کیڈل کورٹ کی چھت ہے۔ یہاں صرف ایک کوٹھری ہے جس میں مالک مکان کا فالتو کوڑا مثلاً پرانی ٹنکی، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں۔ موٹر کے گھسے ہوئے ٹائر، خاک دھول، جھینگر اور مکڑیوں کے درمیان ایک میلی سی دری انسانی ہاتھوں سے بچھائی نظر آئے گی، ایک طرف کچھ نئے پرانے کاغذوں، رسالوں اخباروں کا ڈھیر رسّی پہ میلے کپڑے۔ ایک کونے میں ایک انگیٹھی جس پر سیاہ المونیم کی کیتلی اور دو چار پڑیاں چائے گڑ شکر کی، ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی انسان کی قسم کی شئے بھی بسیرا لیتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پراسرار ہستی کے دیدار سے مستفیض ہو چکے ہیں۔ رات کو آخری ٹرام کے رک جانے کے بعد کیڈل کورٹ پر حیرت انگیز سناٹا چھا جاتا ہے، ایک پراسرار قدموں کی چاپ گونجنا شروع ہوتی۔ پنی تُلی

تھکن میں ڈوبی ہوئی چاپ جیسے ہزاروں قدم ایک سے سُر میں غرق چل پھر رہے ہوں۔ پھر یہ چاپ کیڈل کورٹ کی طرف سرکنا شروع ہوتی ہے اور پھاٹک میں داخل ہو کر لمبے اور تاریک زینوں پر رینگنے لگتی ہے۔ اسی وقفے سے اُسی دن سے قدم ایک سیڑھی پر گرتے اُٹھتے ہیں اور بغیر سستائے کیڈل کورٹ کی چھت پر پہونچ جاتے ہیں۔ اگر کبھی رات کو ایک بجے کے بعد کیڈل کورٹ میں آنکھ کھل جائے تو آپ ان قدموں کو سنتے سنتے کانپ اٹھیں گے جیسے کوئی روح عالمِ بالا کو چڑھ رہی ہو، ایک ایک چاپ گِن لیجئے۔

یہ قدم ایک عجیب اور غریب ہستی کی ملکیت ہیں۔ میں اسے ہستی ہی کہوں گی کیونکہ کیڈل کورٹ کے باسی نہ اس کا نام جانتے ہیں نہ مذہب۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے انھیں بھی شک ہے کہ وہ پتہ نہیں زندہ ہے یا کسی مُردے کا بھوت کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ کوئی پریشان روح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں سرکاری جاسوس ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فرار شدہ مجرم ہے اور اس کے نام کا وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ اور واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ایک بار سُنا کہ وہ ایک ایسے اخبار سے وابستہ ہے جسکا ہر پرچہ ضبط ہو چکا ہے یا قابلِ ضبط ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ کسی مشاعرے میں اس کو پولیس نے دھر لیا ہے۔ پھر ایک ناٹک میں کچھ ایسا فساد انگیز مظاہرہ کیا کہ پولیس نے گھیر لیا۔ مگر اس کی ہستی کچھ ایسی پھسلتی کہ نہ جانے کہاں دبک جاتا ہے۔ وہ جیسے کھٹمل ہوتا ہے ناصدی قسم کا گدّی میں کاٹ لو اور اس سے پہلے کہ شکار سنبھلے پنڈلی میں چٹاک لیا، پنڈلی سلی تو کمر میں دَدوڑے ڈال دیے۔ تو یہی صفت اس کی ہے۔ گورنمنٹ بلبلا رہی ہے، کھُجا رہی ہے اور سر پیٹ رہی ہے۔ پولیس دوڑ

رہی ہے۔ مگر یہ اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ کیڈل کورٹ کے سارے کرایہ دار جانتے ہیں کہ وہ یہاں رہتا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اُسے پکڑوا دے۔ ایک دفعہ کسی نے کوشش کی بھی تو وہ پولیس کے جانے سے پہلے جھینگر بن کر غائب ہوگیا اور پھر کئی مہینے وہ پر اسرار ہیروں کی چاپ کیڈل کورٹ کے زینوں پر نہ سرسرائی۔ لیکن پھر ایک دن اسی طرح وہ ہزار دن پاؤں ایک نئے سرمیں ڈوبے پھر سے چڑھنے اُترنے لگے۔ جن لوگوں نے اُسے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہی پھٹا پتلون اور قمیض ہے وہی پچکے گال اور اُلجھے بال۔ شاید وہی لوٹ کر آگیا ہے۔ مگر شاید۔ کیونکہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

اور یہ پر اسرار قدم ہمیشہ اسی طرح رات کی پر اسرار تاریکی میں گونجتے رہے ہیں۔ ایک تھک جائے تو دوسرا جوڑا ان کی جگہ لے لے گا اور دوسرا تھک جائے گا تو تیسرا۔ اور یہ لامتناہی قدموں کا سلسلہ اسی طرح بغیر لغزش کھائے چلتا رہے گا، اور ایک ایک قدم ہزاروں قدموں میں لبستا چلا جائے گا۔ تو یہ کیڈل کورٹ ہے۔ اوپر سے نیچے تک، فٹ پاتھ سے لے کر خالی آسمان تک، اگر آپ کو ایک پلنگ کی ضرورت ہو تو آہستہ سے کہیئے......
وہ آپ کو نہایت نامعقول پگڑی کے عوض ایک آدھ کونا کھدرا رہنے کو دے دیگا ——— جب لیڈروں کی تصویریں جاگ پڑیں گی اور شکرے میں سے ریت کے ذرّے چھان ڈالیں گی۔ ان گیلے کوئلوں کو اتنا دھونکیں گی کہ ان میں سے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور یہ بھٹھرنہ اور فاقہ

ختم ہو جائیں گے۔ اور موچی کے سر پر کوڑا نہ برسے گا اور کیڈل کورٹ کی چھت پر چھپے ہوئے جھینگر بوسیدہ مال کو چاٹ جائیں گے ....
مگر نہیں .... بھلا کہیں تصویریں بھی جاگا کرتی ہیں۔

پوم پوم ڈارلنگ

جب خاندان میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہوتا ہے تو دھوم دھام سے لوگ اپنی مسرّت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کسی نئے لکھنے والے کا پہلا مضمون کسی رسالہ میں شایع ہوتا ہے تو سارے ماموں، چاچا، خالہ، پھوپھی مل کر اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

جب قرۃ العین کا پہلا افسانہ شایع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ افقِ ادب پر ایک نیا نویلا ستارہ طلوع ہوگیا۔ حجاب دکا سیے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ ننھا منّا سا ستارہ آفتاب ادب بن کر آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ قرۃ العین کا مضمون دیکھ کر رسالہ پر چھینا جھپٹی شروع ہوجاتی، واہ واہ کیا کہنا کرشن چندر جیسی ٹھوس رومانیت، حجاب اسمٰعیل جیسی طلسمی فضائیں اور عصمت جیسے چٹخنے ہوئے مکالمے...... جی نہیں خاص قرۃ العین کی اپنی تراش خراش رنگینی اور لوچ جو کسی خد شے کا محتاج نہیں۔

"اب خیر منایئے ادیبہ صاحبہ!" احمد عباس نے ڈرایا اور میں نے واقعی خیر منائی یہ چھوٹے تو اپنے ساتھ بڑے بن جانے کا خمیر لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے

والے بہت سے جھمیلوں سے بچ جاتے ہیں۔ پہلے گذرنے والے بہت کچھ کیل کانٹے راستے میں سے ہٹا چکتے ہیں اور نئے آنیوالوں کو آگے بڑھنے میں بہت سی آسانیاں مل جاتی ہیں لیکن ایک بات تو ہوگی۔ اب وہ اکیلا اکیلا انوکھا پن نہ رہے گا۔ میدان بھرتا جا رہا ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ آ ہی چکی ہیں اور اب یہ نیا تیر تو یقیناً نشانے پر بیٹھنے کے لئے ہی چلنے پر چڑھا ہے۔ اب تو لوگ "لکھنے والا مرد ہے یا عورت؟" کے سوال میں الجھ کر قلابازیاں کھانا کم کر دیں گے۔ اب تو یہ جانور کہیں کہیں کے بجائے ہر جگہ پایا جائیگا۔ کیونکہ زمانہ بھی تو تہذیب نسواں اور تہذیب مرداں کے بجائے تہذیب انساں کا سوال اٹھا رہا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں مضمون بھی نکلا۔ ستارہ اسی جگہ جگمگاتا رہا۔!

اس کا محور بدلا نہ چال ڈھال!!

دیکھنے والوں نے آنکھیں مل کر دیکھا اور بغور دیکھا کہ کہیں یہ ان کی آنکھیں بڑھاپے سے کمزور تو نہیں ہوتی جا رہی ہیں۔ ستارہ تو کچھ ٹمٹمانے لگا ہے!!!

"ٹھہر و جی ذرا سینڈریلا کے زمین پر اترانے کا انتظار کرو" ناقدنے ڈھارس بندھائی مگر وہ خوابوں کی "چارمنگ" رانی اسی طرح دور خلاؤں میں ٹمٹماتی رہی۔

زمانے کی گھڑیال نے بارہ بجا دیئے اور جادو کی چھڑی کا طلسم تھک کر ٹوٹنے لگا۔

"اجی آپ کی قرۃ العین کیا لکھتی ہیں؟" "جی ہاں، میری قرۃ العین۔

آخر ہمارا اتنا قریب کا رشتہ ہے نا۔ دونوں ایک ہی زنجیر کی اگلی پچھلی کڑیاں ہی تو ہیں۔ نئی کڑیاں تو پرانی کڑیوں سے زیادہ مضبوط ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں، تو پھر یہ بھول چوک کہاں ہوگئی خدایا!

اور میں نے بڑے اہتمام سے ایک طویل ناصحانہ خط لکھنا شروع کیا۔ جس میں میں نے بعد دعا کے واضح کرنا چاہا کہ بھئی یہ شو شو، نو نو، بھارت نا ٹیم، بیوائے ڈیلا مار کے سوئمنگ پول میں کب تک ڈبکیاں لگاتی رہوگی۔ ایک بار ذرا باہر جھانک کر بھی تو دیکھو۔ ایک ہی نکتے پر کتنے چکر دوگی۔ کیا ساری عمر "میری گورا ونڈ" ہی پر گھماتی رہوگی؟ لوگ کہیں بولا نہ جائیں۔ اور پھر جب وہ چڑھ کر تنقید کریں گے تو اس میں جھنجلاہٹ اور انتقام کے نشتر پوشیدہ ہوں گے۔ پھر تمھارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم اس کوچے سے بچ کر کوئی دوسری "ہوبی" پکڑ لوگی!

خط لکھنے کے بعد ایک دم خیال آیا کہیں میرا خط ہی اس پہلے پتھر کا کام نہ کر جائے جس کی طرف میں اشارہ کر رہی ہوں۔ کہیں میرے اعتراض سے دل برداشتہ ہو کر چڑیا پھر سے اُڑ کر دوسری ڈال پر نہ جا بیٹھے۔ لوگ کہیں گے کہ "یہ اوبجے ٹھیکیدار" نئے آنے والوں کو دھمکاتے ہیں تاکہ قبل اس کے کہ ان بیچاروں کا فن پختہ ہو کر مقابلے میں آئے انھیں مار بھگائیں۔ فنکار بڑے حاسد ہوتے ہیں نا۔ دوسرے بھئی شاید میں قرۃ العین کے زمانے سے پیچھے ہوں، اس لئے ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا میں نے ان کے ہم عمروں سے روشنی حاصل کرنا چاہی لیکن انھیں بھی اپنا ہمخیال پاکر کچھ خود اعتمادی پیدا ہوئی اور مجھے افسوس ہوا کہ میں نے وہ خط کیوں پھاڑ ڈالا۔ اور آج جب میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں، احمد عباس

پھر کہہ رہے ہیں "تم نے جان بوجھ کر ایک ہونہار ادیبہ کی راہ نمائی نہ کی، اس کی خامیوں کو پختہ ہونے دیا۔ کیونکہ تم جانتی تھیں، اگر اس کی خامیاں دور ہو گئیں تو وہ سب کو پھلانگ کر میلوں آگے نکل جائے گی۔"

یہ لیجئے، سانپ کے منہ کی چھچھوندر، نہ نگلے بنے نہ اُگلے۔ زمانہ بھی تو بڑا نازک ہے۔ کسی پر تنقید کرو تو لوگ کہتے ہیں کمیونسٹوں نے بہکا دیا ہے جی۔ احمد عباس کو عسکری اور رامانند ساگر کو ایم۔ اسلم سے دُور کا بھی رشتہ بتا دو تو جانو موٹی سی گالی دیدی۔ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ لکھنے والے پڑھنے والوں کے لئے ہی لکھتے ہیں، کچھ چٹخارے لینے کے لئے نہیں لکھتے۔ پڑھنے والوں کی تنقید اور ستائش دونوں کے برابر حقدار ہیں۔ وہ ادیب جو تنقید نہیں سہہ سکتے وہ نہ ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تنقید کرنے والے کا رتبہ اگر وہ ایمانداری سے اپنا فرض انجام دے تو بہت بلند ہے۔ ایک طرف وہ ادیب کے دماغ کو خوراک پہونچاتا ہے تو دوسری طرف ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ اس ادب کی جس کا زندگی سے دامن بندھا ہوا ہے، اور اس طرح وہ زندگی کا بھی محافظ ہے۔ جیسے ہر انسان کو دندان ساز کے پاس وقتاً فوقتاً جانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر ادیب کو تنقید کی ضرورت ہے۔ دانت اکھڑوانے میں دکھ تو بڑا ہوتا ہے مگر صحت بھی جبھی ملتی ہے صرف صحیح تنقید ہی بھٹکنے والے قلم کو سیدھا اور صحت بخش راستہ دکھا کر غلط موڑ سے بچا سکتی ہے۔

لیکن جب قرۃ العین کو خضر راہ دکھانے چلے تو خود اندھیارے میں گھر کر رہ گیا

گئے اور دھکا دے کر واپس لوٹ آنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ وہ ستارا جو آفتاب بن جانے کے آثار لے کر ابھرا تھا بھٹک کر "ستاروں سے آگے" "کچھ بھی نہیں" کی خلا میں گم ہوتا چلا گیا۔ قرۃ العین کو سمجھنے کے لئے بڑی آسانی ہوگی، اگر نذر سجاد حیدر کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ جو ان کا نجی رشتہ ہے، وہی ان کا ادبی رشتہ بھی ہے۔ ادبی شجرے میں "نذر سجاد حیدر" ماں ہیں تو قرۃ العین بیٹی۔ دونوں کا واسطہ ایک ہی طبقے سے پڑا۔ لہٰذا دونوں کے مسائل بھی یکساں ہیں۔ وہ دکھ جو اختر النسا نے جھیلے تھے قرۃ العین کی ڈولی پولی اور اینی جھیل رہی ہیں۔ وہی دکھڑا، وہی، یعنی ٹھیک ناپ تول، شوہر کی نایابی۔ اختر النسا کے والدین جابر ہونے کا الزام ماتھے پر لئے ہوئے تھے اور ڈولی پولی کے والدین مال تیار کر کے ڈرائنگ روموں میں بٹھا دیتے ہیں۔ گھیر گھیر کر کم از کم ۸ سو کمانے والے شکار لاتے ہیں۔ اور کھلی اجازت دیتے ہیں کہ مارو پھندا۔ پھندے چلتے ہیں۔ شکار بھاندا پھوندی کرتے میں پھنس گئے تو ٹھاٹھ کا ایک ایٹم ہوم ہوتا ہے۔ ورنہ ڈولی کا شکار زونی لے بھاگتی ہے، شوشو کو یوم یوم ہڑپ کر جاتی ہے۔ اور ٹوٹلز کو نئی ڈکار جاتی ہے۔ یہ ہے لب لباب ان چارمنگ لوگوں کی رام کہانیوں کا۔

اختر النسا دق کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔ پولی موٓلی ذہنی طور پر مدقوق ہو جاتی ہے۔ کتے انسانوں سے بہتر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر چیز کے پیچھے "کچھ نہ ہونے" کا احساس ستانے لگتا ہے۔ "سب کچھ حاصل کرنے پر بھی موت پر اور کچھ نہ ہونے پر فتح حاصل نہیں ہو سکتی" زندگی اتنی عجیب بن جاتی ہے کہ اُسے کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔ اور وہ نہیں جانتیں کہ "وہ جنگل، وہ پہاڑ، وہ ندیاں، وہ جگہیں کہاں ہیں جہاں

زندگی ہے۔"

اختر النسا کا دشمن سماج تھا۔ پولی ڈولی اور شو شو کے دشمن واہمہ، شعور تحت الشعور لاشعور اور قنوطیت ہیں۔ سماج سے تو کوئی لڑ بھی سکتا ہے مگر ان ذہنی بھوتوں سے کون لڑے Cynic بن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں" نذر سجاد حیدر نے کسی عنصر سے تو بغاوت کی، قرۃ العین حیدر میں وہ بھی سکت نہیں۔ جہاں تک ترقی پسندی کا سوال ہے، ان دونوں کا رشتہ بالکل الٹا نظر آتا ہے۔ یعنی ماں بیٹی سے آگے سوچتی ہے نذر سجاد حیدر جاگیر داری نظام کے زوال کے وقت اٹھی تھی اور قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے زوال کی پیداوار ہیں۔ مگر انھوں نے کم از کم گرتی ہوئی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر سر نہیں پھوڑا تھا۔ جاگیر داری نظام کی خامیوں اور کوتہ اندیشیوں پر ماتم ہی کیا ہے۔ حالانکہ ان کے آنسو بے کار گئے کیونکہ وہ اس نظام کو دوبارہ کھڑا تو نہ کر سکیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے ڈوبتے ہوئے سورج کے اندھیارے میں ہاتھ پیر مار رہی ہیں۔ اس کی عفونت بھری بوسیدگی سے انھیں گھن آتی ہے، مگر پیار بھی ہے۔ وہ اپنے طبقے کو اس مچھلی کے مانند سمجھتی ہیں جس کے ارد گرد کا پانی سر چکا ہے مگر خشک ریت پر بھی موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ کیوں پولی ڈولی کے حسن بھی ہے دولت بھی ہے تعلیم بھی ہے کلچر بھی ہے۔ پھر بھی پوپو ڈولی سے شادی کرنے کے بجائے زونی کے چکر میں پھنس جاتا ہے! جمی زونی کو چھوڑ کر پوم پوم پر کیوں مٹتا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اس کا راز معلوم کرنا ضروری ہے، کہ جب سرمایہ داری نزع کے عالم میں دم توڑنے لگتی ہے تو ذہنی اور اخلاقی انحطاط لازمی طور پر شروع

ہو جاتا ہے۔ جب ایک چیز گلنے سڑنے لگتی ہے تو اس سے ملحقہ چیزیں بھی بجبجا اٹھتی ہیں۔ ایک سرمایہ دار روئی کا بیوپار چھوڑ کر لہسن پیاز کا دھندا سنبھال لیتا ہے بوتی، شوشتم کو چھوڑ کر رضیہ کو پکڑ لیتا ہے، دونوں کی ایک ہی ذہنیت ہے۔ ایک ہی پیشہ اور ایک ہی مقصد۔ جس میں زیادہ منافع ہو وہی ان کا مذہب، وہی ان کا عشق اور وہی ان کی زندگی۔ اس کے باوجود ایک سرمایہ دار یہ بھی جانتا ہے کہ سب کچھ پاکر بھی "کچھ بھی نہیں" کا احساس اس کا وہم نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس کا طریقۂ کار انسانیت کے فلاح و بہبود کے لئے نہیں اسکی ساری اسکیمیں، سارے مارشل پلین سارے سمجھوتے اور گٹھ بندیاں آگے جاکر ایک ایسے نکتہ پر ختم ہو جاتی ہیں جہاں احساس "کچھ بھی نہیں" کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا انجام فنا ہی ہے۔ وہ کانٹے کی نوک پر ٹنگا ہوا ہے اور اس کھولتے اُبلتے طوفان کا چڑھاؤ دیکھ کر لرز رہا ہے۔ جو دن بدن گھیرا تنگ کرتا آرہا ہے۔

اس کی نئی پود یہ بے اطمینانی یہ خوف، یہ زندگی سے فرار اور "کچھ بھی نہیں" ورثہ میں لے کر جنم لے رہی ہے، ان کے شعور اور لاشعور اس ہی سانچے میں ڈھل کر پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں مگر کھلے بندوں نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دشمن کون ہیں۔ قرۃ العین حیدر کبھی کھلے بندوں یہ نہیں کہہ سکتیں کہ عوام ہی ان کے سکون اور عیش کے دشمن ہیں اور ہوا بن کر ڈراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ بڑے سے بڑا عوام دشمن بھی کھل کر اپنے وجود کا اعلان نہیں کر سکتا۔ عوام کو لوٹنے کے لئے ٹھگوں کو بھی بھگت کا روپ دھارنا پڑتا ہے۔

سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کو زندگی کے ہر موڑ پر کمیونسٹ دیکھے ہوئے

نظر آ رہے ہیں۔ سرکار تو سیدھی بھوکے پیٹ میں دبکے ہوئے کمیونسٹ پر لاٹھی چارج اور گولی سے وار کرتی ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر نہایت ہی رومانی ماحول میں نہایت ہی بقعۂ نور قسم کی حسیناؤں کے ذریعے سے کمیونزم پر طنز فرماتی ہیں۔ ان کا کتھا کلی، منی پوری اور رمبا میں مست جوہی کی کلیاں سونگھنے والا قلم جب لفظ کمیونسٹ لکھتا تو ایک دم کالے ناگ کی طرح پھنکارنے لگتا ہے۔ ایک ہی سانس میں کیتھولک چرچ، کمیونزم اور یوگا کی قے کر ڈالتا ہے، اور اس وقت وہ اپنے طبقہ کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ پھر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قلم میں کون سی سیاہی بھری ہے۔ اور اس کا نب کس فرم کا ڈھلا ہوا ہے۔ ان کے چارمنگ لوگ "جیمی کے پانچ عقلمند کتوں کی طرح کسی پارٹی میں شامل ہونے کا پروگرام نہ بناتے ہوئے جب مفکرین کا روپ دھار کر فلسفہ بگھارنے کی کوشش فرماتے ہیں تو بڑا ہی پر لطف منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ ہیڈی لامار بیبی گریبل۔ روبرٹ ٹائلر اور چارلس بوائے کے کالی چمڑی والے چربے اچھے خاصے سیاست داں بننے لگتے ہیں۔ "کس پروف" اور "برگنڈی" کے مستند استعمال کے بعد یہ کام کافی آسان بھی تو ہے۔ اس وقت ان کی نرگسی آنکھوں کو اشتراکی اشتمالی، دہشت پسند کانگریسی، اور لیگی سب کے سب گدھ دکھائی دیتے ہیں اور یہ مفکرین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ سارے کمیونسٹ ان حسیناؤں کے گھائل نامراد عاشق ہیں جو فرار کی غرض سے اور کچھ پھپھولے پھوڑنے کے لئے بیچاری بورژوا لڑکیوں کی ذہنیت پر لیکچر دے کر پارٹی میں جاکر شامل ہو گئے ہیں اور اب دنیا بھر کو گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کیا پتہ کی بات فرمائی ہے محترمہ نے کہ آج

ٹولی مولی، ان بے چاروں کا دل توڑتیں۔ اور نہ یہ کمیونسٹ بنتے۔ تعجب ہے سامراجیوں کو اب تک محترمہ کی دریافت کا کیوں پتہ نہیں چلا ورنہ وہ انھیں ضرور "قیصرِ ہند" کا خطاب عطا فرما دیتے۔ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ کمیونسٹ بنانے کی کلیں یہ حسینائیں ہیں تو بجائے گولی اور لاٹھی چارج میں وقت برباد کرنے کے ایک قانون تحفظِ عاشقاں پاس کر دیں جس کی رو سے کسی مہ جبین کو کسی عاشق کا دل توڑنے کا حق نہ رہے۔ نہ دل ٹوٹیں گے نہ کمیونسٹ پیدا ہوں گے اور جو یہ آئے دن جیلیں بھرتی جا رہی، بھوک ہیل رہی ہے، ہڑتالیں ہو رہی ہیں آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گی اور سرکار کی قوم کی خادماؤں کے لئے بیٹھ کے لیو۔ کیٹن اور ہوا باز فٹا فٹ تیار کرنا شروع کر دے گی۔ بھلا جب ملک کے نوجوانوں کو معلوم ہو گا کہ زوئی، یوم یوم اور فی فی کمیونسٹوں کو پسند نہیں فرماتیں تو وہ فوراً اس بیتے سے تائب ہو جائیں گے، آج کل ہر ملک کی سامراجی طاقتیں ان کمیونسٹوں کے ہاتھ تگنی کا ناچ ناچ رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ محترمہ کی یہ دریافت ایٹم بم کا رتبہ حاصل کر جائے اور انھیں بین الاقوامی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔

یہ نہیں تو کم از کم انھیں کمیونسٹوں کے اوپر کیچڑ اچھالنے میں سامراجیوں کا ہاتھ بٹانے کے عوض کچھ تو انعام ملنا ہی چاہیے حالانکہ جہاں تک عوام کے فیصلہ کا سوال ہے یہ حربہ خالی جائے گا۔ اگر آپ ان سے جا کر کہیں کہ یہ تمھارے نمایندے ہم مقدس بچیوں پر زبردستی عاشق ہو جاتے ہیں، اور اگر ہم انھیں ٹھکرا کر آٹھ سو کمانے والوں سے شادیاں کر لیں تو یہ جل کر تم سے جا ملتے ہیں اور تمھیں ہمارے خلاف بھڑکانے لگتے ہیں، تو وہ اسے آپ کا بھاگتے وقت کا آخری پتھر سمجھ کر منہ

موڑلیں گے۔ انھیں اپنے نمائندوں کے چال چلن کی تصدیق کرنے کے لئے یوم یوم ڈارلنگ کے سرٹیفکیٹ کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ اتنے احمق نہیں جتنا آپ انھیں سمجھتی ہیں۔ وہ اب اپنے دشمن کی بساند دور ہی سے سونگھ لیتے ہیں۔

اتنی بات یاد رہے کہ کمیونسٹ جو چین، برما، انڈونیشیا اور تلنگانہ میں سامراجیوں کے چھکے چھڑا رہے ہیں۔ یہ وہ آپ کے دربار میں مصاحبی کرنے والے گداگر نہیں جو دولت کی کمی کو ترقی پسندی اور اشتراکیت کے لبادے میں لپیٹ کر محبوبہ کے قدموں میں ڈالتے تھے کیونکہ یہ وہ ہمارے تمہارے زمانے کے کمیونسٹ ہیں یہ قطعی رومینٹک اور رسیلے نہیں۔ نہایت چالاک، تلخ زبان۔ لاٹھی چارج سے یہ نہیں رکتے۔ گولی کو یہ خیال میں نہیں لاتے۔ مرکے یہ نہیں ختم ہوتے تو بھلا یہ مہ جبینوں کے نخروں کو خاطر میں کب لائیں گے۔ ٹولی مولی ہزار بار ان پر عاشق نہ ہونے کی دھمکی دیں۔ ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگے گی۔

ان کی محبوبہ وہ زودی نہیں جو جمی کے عشق میں ناکام ہو کر فتح کشمیر کے ارادے سے تفریحاً تراڑ خیل دوڑ پڑتی ہے۔ بلکہ وہ زودی ہے جو تلنگانہ میں اپنی زمین کے ذرہ ذرہ کی خاطر اپنے محبوب کے دوش بدوش بڑھ رہی ہے جو کلکتہ میں سامراجی گولیاں سینہ پر کھائے سڑک پر خون میں نہا رہی ہے جو بمبئی میں اپنے پیاروں کو بھوکا مرتا دیکھ کر، لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھار میں سینہ سپر ہو رہی ہے۔ وہ اور ہی طبقہ ہے جو ڈی لامار" اور "سیوائے" کے چکنے فرش کے تخیل ہی سے پھسل پڑتا ہے۔

ایک بار بطرس نے میرے اوپر اعتراض کیا تھا کہ میں درمیانہ درجہ کی

عکاسی تو کر لیتی ہوں لیکن ڈرائنگ روم میں جاکر چوکڑی بھول جاتی ہوں، مجھے بڑا دکھ ہوا تھا کہ لوبھئی ٹیلرمس صاحب کو بھی پتہ چل گیا کہ میں ڈرائنگ روم کی مخلوق نہیں ہوں، لیکن اب شکر کرتی ہوں کہ اچھا ہوا۔ میری پھوہڑ ماں اور کثیر الاولاد باپ کو ڈرائنگ روم سجانے کی توفیق نہ ہوئی، ورنہ میرا واسطہ بھی ٹوٹو فوفو کے سوا کسی انسان سے نہ پڑتا۔ اور آج یہ درمیانہ طبقہ کے جھمیلوں سے بھی بےکار جھمیلے میرا موضوع ہوتے۔ میں ان ہی پر شرمندہ ہوں لیکن یہ درمیانہ طبقہ پھسل پھسل کر مزدور کی آغوش میں گر رہا ہے۔ اس طبقے کے سارے ادیب اگر فرار میں نہ ڈوب گئے تو ایک دن وہیں پہنچ جائیں گے۔

مگر قرۃ العین کے کردار اور ان کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ چارمنگ لوگ سب کے سب ایک ہی فرمہ کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ سب ہی تو مرغابیوں کے سگار برگنڈی، کیوٹیکس، رابرٹ ٹائیلر کے سلونے حسن، کارمن میرانڈا کے گالوں الیتھر ولیم کی سڈول پنڈلیوں کے دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ عیسائی یتیم خانوں کی تعلیم جہاں ذوقِ شعری "ٹوئیکل ٹوئنکل لٹل اسٹار" سے شروع ہوکر چارج آف دی لائٹ بریگیڈ پر ختم ہوجاتا ہے اور نثر کا مطالعہ باپ دادا کی بوسیدہ لائبریوں میں ٹھونسی ہوئی چند پراسرار جرمن، فرانسیسی، ترکی اور انگریزی کتابوں تک محدود نظر آتا ہے، ویسے بھی صورت شکل میں، چال ڈھال میں سب یکساں ہی نظر آتے ہیں۔ وہی خاموش جھیلوں جیسی نیلی آنکھیں، سنہری گھونگھر والے بالوں کی مالک لڑکیاں اور سارے کے سارے گیلنٹ ہنڈسم نوجوان۔ نہ کبھی کسی کو حیجارنے گھر اکیا نہ ٹائیفائڈ نے گنجا کیا۔ نہ کبھی کسی کے خون میں کمی پیدا ہوئی۔ سوائے عشق کے کبھی کسی کو

کوئی روگ نہیں ستاتا۔ کبھی کوئی بے جوڑ وباؤں کا شکار نہ ہوتا کیونکہ ان کے بارے میں کوئی لنگڑا لولا پھٹکنے ہی نہ پاتا۔ ایک بار کسی نے کہا تھا کہ قرۃ العین کے یہاں جنسی لگاؤ کا ذکر نہیں ہوتا۔ عریانی نہیں ہوتی۔ ویسے تو یہ بڑی اچھی بات ہے فحاشی کوئی فخر کی بات نہیں۔ لیکن اس فضا کو جو ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے کس قسم کی گھٹن سمجھا جائے؟ لڑکوں اور لڑکیوں کے جھگھٹے ہوتے ہیں مگر ایک عجیب قسم کی بے حسی طاری رہتی ہے۔ حسینائیں بالکل تھوک کے مال کی طرح پرکھتی ہیں اور پرکھی جاتی ہیں۔ جانو ٹھونک بجا کر تانبے کی پتلیاں خریدی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی ایکسپورٹ امپورٹ ہو رہی ہے جیسے وہاں منڈی کی تلاش میں سمجھوتے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح پراسپکٹس کی تلاش میں شادی بیاہ ہوتے ہیں۔ احساسِ جنسی کبھی کام کے آتے اور روئی کی بوریوں والا احساس رہ گیا ہے۔ عشق میں جو بہت ہوا تو بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے" اور ناکامی کے بعد ترارِ مخیل روانگی ہو جاتی ہے۔

کردار نگاری کو چھوڑ کر اگر اندازِ تحریر کو دیکھا جائے تو اس میں انفرادیت اور انوکھا پن کافی موجود ہے، ہاں کبھی کبھی انگریزی کے بعض الفاظ بھونڈے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات اُلٹے سیدھے ایک دوسرے سے کچھ اس طرح دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ اب نکتہ ابھرتا ہے اس کی موافقت اور مخالفت کے سارے نکات دوڑ کر ساتھ لپٹ جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ "ہاں" کہہ رہی ہیں یا "نا"۔ حماقت اور عقلمندی کی باتیں ایک سانس میں ایک ہی ارادے سے املا کرتی ہیں عام طور پر لکھنے والا ایک کردار چن لیتا ہے جو اس کے اپنے معیار پر پورا اتر سکے جس میں

وہ خود اپنی ہستی کو چھپا کر بٹھا دیتا ہے۔ وہ جو پڑھنے والے کو اپنے میں جذب کرنے کے جگ بیتی کو آپ بیتی کی چاشنی بخشتا ہے۔ یہ کردار کوئی خیالات کا ہیولا نہیں بلکہ حقیقت سے وابستہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرانے والا کردار ہوتا ہے۔ مگر مس حیدر کا ہر کردار کوئی نہ کوئی ایسی چھچھوری حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اسکی پوری تصویر میں ایک بے ہنگم سا کوبڑ نکل آتا ہے۔ ویسے آدمے کا آدھا ہی کچھ حصے سے زیادہ چار منگ۔ لیکن اس کے سوچنے میں بھی باٹا کے جوتوں جیسی یکسانیت نظر آتی ہے۔ پڑھنے والے کو کچھ سوچنے سمجھنے میں مدد نہیں ملتی شاید اسی یکسانیت سے اکتا کر خود مصنفہ کبھی کبھی پڑھنے والے کو اچھال کر کسی بال روم یا ہوٹل میں رقص کے دو چار چکر دے دیتی ہیں۔ کبھی جوہی کی کلیاں ناک میں ٹھونس دیتی ہیں۔ کبھی ستاروں اور آبشاروں میں گھسیٹ لیجاتی ہیں۔

کرشن چندر کا کہنا ہے کہ " وہ اب رقص گاہ کی روشنی کے ساتھ ساتھ باہر کا اندھیرا بھی دیکھنے لگی ہیں " شرطیہ یہ انھوں نے تکلفاً کہا ہے ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں لکھا کیونکہ فی فی، شی شی، اگر کبھی بھولے سے اندھیرے میں جاتی ہیں تو فوراً ٹولڈر جیسی اور شوشو کی برقی ٹارچ چمک اٹھتی ہے۔ اس لئے وہ اندھیرا کہیں نہیں دیکھتیں در اصل انھوں نے اجالا کبھی نہیں دیکھا۔ ابھی تک وہ فرحت گاہوں اور سرکسوں کی لبقعہ نور فضا میں ٹٹول رہی ہیں۔ شمع زندگی کی لو انھوں نے نہیں دیکھی کہ کتنی بلند ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کے تخیل کے شیش محل کی بڑی موٹی موٹی دیواریں ہیں اور ہر روزن پر بیش بہا ایرانی قالین منڈھے ہوئے ہیں۔ باقی سارے لوازمات پر گرد جم چکی ہے یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کے قلم کا سارا چلبلاپن اور ساری پھرتی ایک گھٹے ہوئے ماحول میں بیدم نظر آتی ہے۔ نئی لکھنے پڑھنے والیوں میں وہی فرسودہ دماغ بجائے حسین اور

زندہ نقوش کھینچنے کے سر یلسٹک کیل بلو پنچے بنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مس حیدر بھی مس حجاب اسمٰعیل کی طرح "ممی" اور "لاشوں" کے قصے لکھنے لگیں گی۔ ویسے گو اب بھی اِن کے کردار کچھ کم حنوط کئے ہوئے نہیں ہوتے۔

سوال اُٹھتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا ختم ہو رہی ہے۔ بڑی تیز رفتاری سے ختم ہو رہی ہے۔ اسپین، چین، انڈونیشیا کشمیر سب ختم ہو رہے ہیں۔" کیونکہ وہ سامراجیوں کے چنگل سے چھوٹے جا رہے ہیں۔ بے شک ان کی دنیا مر رہی ہے۔ ختم ہو رہی ہے۔ چین میں سامراج دم توڑ چکا ہے اور باقی ممالک میں بھی پڑا سسک رہا ہے۔" ان کی انسانیت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے اور اب اگر ساری دنیا کی زوفیاں بھی ایمبولنس لے کر دوڑ پڑیں تو اس لبِ دم مریض کو نہ بچا سکیں گی۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں، انھیں خود اپنی باتوں پر یقین نہیں۔ ایک دوسرے پر یقین نہیں" زندگی سے، ماضی سے مستقبل سے" اب آئیوری کے برج میں بیٹھکر قنوطی باتیں کرنے سے بھی کام نہیں چلتا۔ ان کے لئے زندگی، موت ہی کا ایک حصہ ہے۔ ہر چیز کی آڑ میں کچھ نہ ہونے کا ہوا ڈرا رہا ہے اپنے انجام کے آثار، محلے ٹوٹے میں گرتی ہوئی دیواروں کے دھماکوں سے دکھائی دینے لگے ہیں ——— "دنیا" مر رہی ہے۔ دم گھٹ رہے ہیں۔

ویسے فساد کے زمانے میں تو اچھی خاصی گزر گئی۔ پرانی کوٹھی بند ہو کر سرخ قالینوں اور لکڑمسی کے گہواروں پر گرد جم گئی تو یہ لوگ مع کتوں کے ہوائی جہاز میں لد کر نئے ملک میں قہوہ پینے اور خواب دیکھنے لگے۔ تو پھر یہ ہائے توبہ یہ وحشت صرف اسی

طاقت کی ہو سکتی ہے جواب انھیں بے دیکھے نظر آنے لگی ہے۔ نئی نویلی عمر میں یہ احساسِ مردنی، یہ فرار اور یاسیت کیا معنی رکھتی ہے۔ شاید سرمایہ دار کی نئی پود ہی گھٹی ہوئی پیدا ہو رہی۔ مردہ بن، فرار اور یاسیت کے جراثیم اسے ورثے ہی میں مل رہے ہیں۔ "سب کچھ پا کر بھی کچھ نہیں کا احساس"...... "دنیا فانی اور چند روزہ ہے"۔ "زندگی کو کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے" یہ سب کچھ ان کی ہڈیوں میں رچا ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ انھیں یہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ اب یہ چادر کسی پیوند پارے سے نہیں گو نتھی جا سکتی۔ اس کی دھجیاں اُڑ کر رہیں گی۔ کچھ تو یہ "ڈولی مولی" چھینا جھپٹی میں مسکا دیں گی، اور رہی سہی مارشل پلانوں، ڈالر اسکیموں اور سمجھوتوں کی لوٹ کھسوٹ میں تار تار ہو جائیں گے۔ بقول کسے :-

اپنے مرکز ہی سے ٹکراتا ہے زر کا پھیلاؤ

اور یہ دُنیا کے ختم ہونے کا احساس وہ دوسروں کو بھی دلانا چاہتی ہیں۔ ویسے بات بیحد رومینٹک معلوم ہوتی ہے۔ مگر سمجھنے والوں کو نکتہ بھی کام کا مل جاتا ہے۔ ان لوگوں کا مقصد عوام کے دلوں میں یاسیت اور فرار پیدا کرنا ہے۔ کہ یہ زندگی فانی ہے۔ مارشل پلان بنتے ہیں تو بھائیوں تمھاری بلا سے، جینا ہی کتنے دن کا ہے۔ ڈالر کے جال پھیلے جا رہے ہیں تو کیا ہے۔ ہم تو دو گھڑی کے مہمان ہیں۔ کیا اس دو روزہ زندگی میں کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر عوام کے حقوق مانگتے ہو؟ "یہاں تو زندگی بھی موت ہی کا اک حصہ ہے"۔ کچھ عمدہ عمدہ مرنے کے طریقے بتائیں۔ آیس میں کٹ مرو۔ چاہو تو مذہب کا شوشہ اٹھا سکتے ہو، ملک اور قوم کا ڈھونگ رچالو۔ مگر

اپنے بچے کے دودھ کی فکر میں نہ گھلو۔ اپنی بیوی کی پھٹی ساری کی پرواہ نہ کرو۔ یہ قطعی غیر رومانی باتیں ہیں۔ غذا اور ستر پوشی کے علاوہ اور بھی تو ضروریات زندگی ہیں۔ جمی کے پانچ اسپینل بھی تو ہیں۔ ان میں دلچسپی لو۔ ادھر دیکھو، غریب زدفی نامرادی کے مارے ترا ترخیل دوڑی جا رہی ہے۔ کیونکہ جمی ڈولی کا ہوگیا ہے کتنا ان رومینٹک سانحہ ہوگیا۔ یہ کیا بکبکار کو الکشن گرڈ بڑا کے اچھے بھلے انکل اور ڈیڈی کا ناطقہ بند کئے دے رہے ہو۔ اس کے بجائے اپنی روحوں کو فربہ کرو۔ شعور اور لاشعور کی گتھیوں کو سمجھو۔ "آؤ ہمیں" "ستاروں سے آگے" خلا میں اُلٹا لٹکا دیں، وہاں کمیونسٹ پر نہیں مار سکتے۔

ویسے بھی اس سے تو بہتر ہے کہ تم سب لیو کیپٹن اور ہوا باز کیوں نہیں بنجاتے۔ کم سے کم چارلس بوئے یا رابرٹ ٹائیلر ہی بن جاؤ۔ تاکہ موتی ڈولی کے سہروں کے پھول بھی کھل جائیں۔ کب سے نگوڑیاں کانوینٹ چھوڑے بیٹھی ہیں۔ گاہکوں کی کمی کی وجہ سے مال گھٹا کر لاشعور بوکھلائے جا رہے ہیں۔ اس طرح دنیا کی بے کاری بھی مٹ جائے گی۔ جیرٹی اور دودو۔ کیا گُر کی باتیں ہیں۔ مگر کوئی سمجھے جب نا کیا بے قدری ہے اس ملک میں انٹلک چوئل کی!

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ ساری بکواس کرنے کے بعد میں مارکسی فلسفہ کی لمبی سی مشعل لے کر قرۃ العین کی رہنمائی کرنے چل پڑوں گی۔ اور ان سے کہوں گی کہ "اپنی نئی اسٹوڈی بیکر جس میں آگے بھی شیشہ ہے اور پیچھے بھی" میں بیٹھ کر وہ بھنگی کولونی میں چلی جائیں اور ان کے ساتھ رہکر ان کے لئے عوامی ادب تیار کرنے لگیں۔ جی نہیں۔ اوّل تو عوام کو مصنفوں کی مدد کی ضرورت نہیں، اگر ساری عمر

بھی ہم شہنشاہوں کے سہرے اور مرثیے لکھتے رہیں تب بھی عوام کی جدوجہد کو نقصان نہیں پہونچ سکے گا۔ انقلاب کی جنگ صرف مزدوروں اور کسانوں کی جنگ ہے۔ ہم مصنفین کی حیثیت اس بحرِ بےکراں میں ایک چلّو سے زیادہ نہیں۔ ممکن ہے ہماری پالیسی ان کی فتح میں چند گھنٹوں کا فرق ڈال سکے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اب یہ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اپنے چند گھنٹے کس پارٹی کو دیں۔ گرتے ہوئے سامراج کو یا اٹھتے ہوئے عوامی جذبے کو۔ انھیں ایک گھنٹہ زیادہ جلائیں یا ان کی مشکل جلد از جلد آسان کر کے عوام کی فتح کی تاخیر کو مٹائیں۔ ہمارے اس فیصلہ پر ہمارے فن اور اسکی بقا کا انحصار ہے۔

اس کے علاوہ عوام کی مدد کرنے کا یہی طریقہ نہیں کہ ہم اوٹ پٹانگ، بغیر جانے بوجھے، ان کے بارے میں لکھنا شروع کر دیں۔ وہ جو واقعی عوام میں جذب ہو کر ان کے بن سکتے ہیں تو کیا کہنے۔ لیکن وہ جن کی وسعتیں محدود ہیں اور وہ درمیانہ طبقے سے ہی زیادہ قریب ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے طبقے کی صرف عکاسی ہی نہ کریں بلکہ اپنے فن کی مدد سے ان کے خاکوں میں جاذبِ نظر رنگ آمیزی سے صحت بخش نظریہ پیش کریں۔ انھیں مزدور طبقے سے روشناس کر کے قریب تر لائیں۔ ان کی فضول قدروں کی حماقت اور صحیح قدروں کی خوبصورتیوں کو اجاگر کرنے میں مدد دیں۔ اس لئے قرۃ العین کا فرض ہے کہ وہ کم از کم اپنے طبقے ہی کی ایمانداری سے ایسی عکاسی کریں اور ان میں ایسے رنگ بھریں جو ان کی الجھنوں کا جواب بن سکیں۔ اُلٹے سیدھے فوٹو اتارنے کے بجائے ایسے رنگین مرقعے تیار کریں جنھیں دیکھ کر روزی اور پوم پوم سوچیں اور سمجھیں کہ انھیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔ کم از کم یہی بتائیں کہ یہ بےچاریاں

کن ہتھکنڈوں کے ذریعے شادی کے بازار میں کامیاب چھینا جھپٹی کریں کہ "بیچاری عورت کچھ تو کم ٹریجک مخلوق بن سکے" یہ کیا کہ ایک طرف وہ کمیونسٹوں اور ان کے ارادوں سے ناراض ہیں، دوسری طرف لوگوں کے دل میں ہراس اور "کچھ نہیں" کا احساس شدت سے پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

مگر یہ میں نے غلط رائے دی۔ اس طبقہ کو سدھارنے کی کوشش اتنی ہی فضول ہے جتنی مینڈکوں کو اڑنا سکھانے کی۔ یہ پود تو بے بال و پر لنڈ منڈ ہی پیدا ہو رہی ہے۔ دق تیسرے درجے کو پہونچ چکی ہے۔ اب تو وقت دوا اور دعا دونوں نکل چکے۔ یہ تو اب یوں ہی دماغی اور روحانی شعور اور لاشعور کے مرضوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ اب تو بہتر یہی ہے کہ قرۃ العین ان کی مٹی عزیز کرنے میں جو کچھ بھی مدد کر سکتی ہیں کر ڈالیں ثواب ملیگا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اُن عقابوں سے نکیلے پنجوں پر سان رکھی جائے جو اس لب دم مریض پر جھپٹے مار رہے ہیں اور کوئی دم میں تکا بوٹی کیا چاہتے ہیں۔ چلتے چلتے اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ہمیں قرۃ العین کے قلم سے ایک لگاؤ ہے، عجیب قسم کا پیار ہے جیسے جھٹکے وقت وہی پرانی رسمی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور جی چاہتا ہے کاش ان کی یوم یوم ڈارلنگ ایک بار ان موٹے موٹے ایرانی قالینوں کو دور پھینک کر ادھ مرے جاں منگ لوگوں کو بھول کر چل پڑے...... مثلاً بمبئی...... پھر یہاں اس کو ایک کامریڈ ملجائے جو اپنے آئیڈیلز کے لئے دنیا سے لڑکر میدان میں آیا، پھر وہ اس سے شادی کرے تو جیمی زونی کی محبت اُسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ گھر کا خرچ پورا کرنے کیلئے کسی اسکول یا اخبار کے دفتر میں نوکری کرلے

اور شام کو دوستوں میں بیٹھکر سوشلزم بگھارے اور ان کے لئے کافی تیار کرے۔"
بخدا کافی بنانا "ان جار مگ بوروں" سے مغز پچی کرنے سے ہزار درجہ زیادہ سہل اور
دلچسپ مشغلہ ہے اور پھر جب اس کے بچہ کا باپ شاعر یا ادیب ہونے کے جرم میں
نامعلوم میعاد کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے تو ہر ہفتہ ننھے بچے کو گود میں لے کر
اس سے ملنے جائے۔ خدا نے چاہا تو پرانے جراثیم مر جائیں گے۔ ٹونی۔ فی فی اور
جیمی کے پانچ غیر جانبدار کتوں کی جدائی شاق نہ گزرے گی۔ ایک ڈولڈر کو چھوڑ کر
دوسرے کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ اپنے پرانے خول سے
نفرت بھی نہ رہے گی۔ صرف کبھی کبھی پھریری آجائے گی۔

"کچھ بھی نہیں "مٹ کر" بہت کچھ جنم لے گا۔ جمی ہوئی گرد جھڑ جائے گی
اور مردہ زندگی میں چہل پہل جاگ اٹھے گی سارے واہ کہیں بیسویں صدی میں بھی
معجزے ہو سکتے ہیں!!!

جڑیں

سب کے چہرے فق تھے گھر میں کھانا بھی نہ پکا تھا۔ آج چھٹا روز تھا۔ بچے اسکول چھوڑے گھروں میں بیٹھے اپنی اور سارے گھر والوں کی زندگی وبال کئے دے رہے تھے۔ وہی مار کٹائی ڈھول دھپا، وہی اودھم اور قلابازیاں جیسے ۱۵ اگست آیا ہی نہ ہو۔ کمبختوں کو یہ بھی خیال نہیں کہ انگریز چلے گئے اور چلتے چلتے ایسا گہرا گھاؤ مار گئے جو برسوں رسے گا۔ ہندستان پر عمل جرّاحی کچھ ایسے لنجے ہاتھوں اور گھٹل نشتروں سے ہوا ہے کہ ہزاروں شریانیں کٹ گئی ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ ٹانکہ لگا سکے۔

کوئی اور معمولی دن ہوتا تو کمبختوں سے کہا جاتا باہر کالا منہ کرکے غدر مچاؤ لیکن چند روز سے شہر کی فضا ایسی غلیظ ہو رہی تھی کہ شہر کے سارے مسلمان ایک طرح سے نظر بند بیٹھے تھے۔ گھروں میں تالے پڑے تھے اور باہر پولیس کا پہرا تھا۔ لہذا کلیجے کے ٹکڑوں کو سینے پر کودو دلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ویسے سول لائنس میں امن ہی تھا جیسا کہ عام طور پر رہتا ہے یہ تو گندگی وہیں، زیادہ اچھلتی ہے جہاں چہ بچے

ہوتے ہیں۔ جہاں غربت ہوتی ہے۔ وہیں جہالت کے گھورے پر نام نہاد مذہب کے ڈھیر بجبجاتے ہیں اور یہ ڈھیر کر یدے جا چکے تھے۔ اوپر سے پنجاب سے آنے والوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی تعداد اقلیت کے دل میں دہشت بٹھا رہی تھی۔ غلاظت کے ڈھیر تیزی سے کریدے جا رہے تھے اور عفونت رینگتی رینگتی صاف ستھری سڑکوں پر پہونچ چکی تھی۔ دو چار جگہ تو کھلم کھلا مظاہرے بھی ہوئے لیکن مارواڑ کی ریاستوں کے ہندو مسلمان کی اس قدر ملتی جلتی معاشرت ہے کہ انھیں نام صورت یا لباس سے بھی باہر والے مشکل سے پہچان سکتے ہیں۔ باہر والے اقلیت کے لوگ جو آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے وہ تو پندرہ اگست کی بو پاکر ہی پاکستان کی حدود میں کھسک گئے تھے رہے ریاست کے قدیم باشندے تو نہ ہی ان میں اتنی سمجھ اور نہ ہی ان کی اتنی حیثیت کہ پاکستان اور ہندوستان کا دقیق مسئلہ انھیں کوئی بیٹھ کر سمجھاتا جنھیں سمجھنا تھا وہ سمجھ چکے تھے اور وہ محفوظ ہو چکے تھے، باقی جو یہ سُن کر گئے تھے کہ چار سیر کا گیہوں اور چار آنے کی ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ ملتی ہے وہ لوٹ رہے تھے، کیونکہ وہاں جاکر انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ چار سیر کا گیہوں خریدنے کے لئے ایک روپیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ کے لئے پوری چوَنی دینا پڑتی ہے اور یہ روپیہ اٹھنیاں نہ ہی کسی دوکان پر ملیں اور نہ کھیتوں میں اُگیں۔ انھیں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زندہ رہنے کی تگ و دو۔

لہٰذا جب کھلم کھلا علاقوں سے اقلیت کو نکالنے کی رائے ہوئی تو بڑی

مشکل آن پڑی۔ ٹھاکروں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب رعایا ایسی گھتی ملی رہتی ہے مسلمانوں کو بین کر نکالنے کے لئے باقاعدہ اسٹاف کی ضرورت ہے جو کہ بیکار زائد خرچ ہے ویسے آپ اگر کوئی ٹکڑے زمین کے شرنارتھیوں کے لئے خریدنا چاہیں تو وہ خالی کرائے جا سکتے ہیں۔ جانور تو رہتے ہی ہیں جب کہئے جنگل خالی کرا دیا جائے۔

اب باقی رہ گئے چند گنے چنے خاندان۔ جو یا تو مہاراجہ کے چیلے چانٹوں میں سے تھے اور جن کے جانے کا سوال نہ تھا یا وہ جو جانے کو تلے بیٹھے تھے۔ بس بستر بندھ رہے تھے۔ ہمارا خاندان بھی اسی فہرست میں آتا تھا۔ جب تک بڑے بھائی اجمیر سے نہ آئے تھے کچھ ایسی جلدی نہ تھی مگر انھوں نے تو آکر بوکھلا ہی دیا۔ پھر بھی کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ تو شاید کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی اور برسوں اسباب نہ بندھ چکتا جو اللہ بھلا کرے چھبا میاں کا وہ پینترا نہ چلتے۔ بڑے بھائی تو جانے ہی والے تھے کہہ کر ہار گئے تھے۔ تو میاں چھبا نے کیا کیا کہ ایک دم اسکول کی دیوار پر "پاکستان زندہ باد" لکھنے کا فیصلہ کر لیا روپ چند جی کے بچوں نے اس کی مخالفت کی اور فوراً "اکھنڈ ہندستان" بگاڑ کر لکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ چل گیا جوتا اور ایک دوسرے ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی فرمائی گئی، بات بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ پولیس بلائی گئی اور جو چند گنتی کے مسلمان بچے تھے۔ انھیں لاری میں بھر کر گھروں کو بھجوا دیا گیا۔

اب سُنئے کہ جوں ہی بچے گھر میں آئے ہمیشہ ہیضہ طاعون کے سپرد کرنے والی مائیں۔ مامتا سے بے قرار ہو کر دوڑیں، اور انھیں کلیجے سے لگا لیا گیا

اور کوئی دن ہوتا اور روپ چند جی کے بچوں سے چھبا لڑکر آتا تو دُلھن بھابی اس کی وہ جوتیوں سے مرہم پٹی کرتیں کہ توبہ بھلی اور اٹھا کر انھیں روپ چند جی کے پاس بھیج دیا جاتا کہ پلائے اُسے انڈی کا تیل اور کونین مکسچر کیونکہ روپ چند جی ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہی نہیں ابا کے پرانے دوست تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی دوستی ابا سے۔ ان کے بیٹوں کی بھائیوں سے۔ بہوؤں کی ہماری بھاوجوں سے۔ اور نئی پود کی نئی پود سے آپس میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ دونوں خاندانوں کی موجودہ تین پیڑھیاں ایک دوسرے سے ایسی گھلی ملی تھیں کہ شبہ بھی نہ تھا کہ ہندستان کی تقسیم کے بعد اس محبت میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ حالانکہ دونوں خاندانوں میں مسلم لیگی کانگریسی اور مہاسبھائی موجود تھے اور مذہبی اور سیاسی بحثیں بھی جم جم کر ہوتیں مگر ایسے ہی جیسے فٹ بال یا کرکٹ میچ ہوتے ہیں۔ ادھر ابا کانگریسی تھے تو اُدھر ڈاکٹر صاحب اور بڑے بھائی لیگی تھے، تو ادھر گیان چند مہاسبھائی ادھر منجھلے بھائی کمیونسٹ تھے تو اُدھر گلاب چند سوشلسٹ۔ اور پھر اسی حساب سے مردوں کی بیویاں اور بچے بھی اسی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر جب مچیٹا ہوتا تو کانگریس کا پلہ بھاری پڑتا۔ کمیونسٹ سوشلسٹ بھی گالیاں کھاتے، مگر کانگرس ہی میں گھس پڑتے۔ رہ جاتے مہاسبھائی اور لیگی یہ دونوں ہمیشہ ساتھ دیتے۔ گو وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے۔ پھر بھی دونوں مل کر کانگرس پر حملہ کرتے۔

لیکن ادھر کچھ سال سے مسلم لیگ کا زور بڑھتا گیا اور اُدھر مہاسبھا کا۔ کانگریس کا تو بالکل پتلا ہو گیا۔ بڑے بھائی کی سپاہ سالاری میں گھر کی ساری نئی پود سوائے دو ایک غیر جانب دار قسم کے کانگریسیوں کو چھوڑ کر نیشنل گارڈ کی طرح ڈٹ گئی

ادھر گیان چند کی سرداری میں سیوک سنگھ کا چھوٹا سا دل ڈٹ گیا۔ مگر دوستی اور محبت میں فتور نہ آیا۔

"اپنے للّو کی شادی تو منّی ہی سے کروں گا" مہا سبھائی گیان چند منّی کے لیگی باپ سے کہتے "سونے کی پازیب لاؤں گا"

"یار ملمع کی نہ ٹھوک دینا۔" یعنی بڑے بھائی گیان چند کی ساہوکاری پر حملہ کرتے ہیں۔

اور ادھر نیشنل گارڈ دیواروں پر پاکستان زندہ باد لکھ دیتے اور سیوا سنگھ کا دل اسے بگاڑ کر "اکھنڈ ہندستان" لکھ دیتا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پاکستان کا لین دین ایک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ تھا۔

ابا اور روپ چند جی یہ سب کچھ سنتے اور مسکراتے اور سارے ایشیا کو ایک بنانے کے منصوبے باندھنے لگتے۔

اماں اور چاچی سیاست سے دور دھنیے ہلدی اور بیٹیوں کے جہیزوں کی باتیں کیا کرتیں اور بہوئیں ایک دوسرے کے فیشن چرانے کی تاک میں لگی رہتیں نمک مرچ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے دوائیں بھی منگوائی جاتیں روز۔ کسی کو چھینک آئی اور دوڑا ڈاکٹر صاحب کے پاس یا جہاں کوئی بیمار ہوا اور اماں نے دال بھری روٹی یا دہی بڑے بنوانے شروع کئے اور ڈاکٹر صاحب سے کہلوا دیا کہ کھانا ہو تو آجایئے۔ اب ڈاکٹر صاحب اپنے پوتوں کا ہاتھ پکڑے آن پہونچے۔

چلتے وقت بیوی کہتیں "کھانا نہ کھانا سُنا!"

"ہوں تو پھر فیس کیسے وصول کروں۔ دیکھو جی لالہ اور جُبنی کو بھیج دینا"

"ہائے رام تمھیں تو لاج بھی نہیں آتی۔" چاچی بڑبڑاتیں۔ مزہ تو جب آتا جب کبھی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ اماں کانپ جاتیں۔

"نا بھئی میں اس مسخرے سے علاج نہیں کراؤں گی۔" مگر پھر گھر کے ڈاکٹر کو چھوڑ کر کون شہر سے بلانے جاتا۔ لہٰذا سنتے ہی ڈاکٹر صاحب دوڑے آتے۔

"اکیلی اکیلی پلاؤ زردے اُڑاؤ گی تو آپ بیمار پڑو گی۔" وہ جلاتے

"جیسے تم کھاؤ ہو ویسے ہی اوروں کو سمجھتے ہو۔" اماں پردے کے پیچھے سے بھناتیں۔

"ارے یہ بیماری کا تو بہانہ ہے۔ بھابی تم ویسے ہی کھلوا دیا کرو۔ میں آجایا کروں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو۔" وہ آنکھوں میں شرارت جمع کر کے مسکراتے اور اماں جل کر ہاتھ کھینچ لیتیں اور صلواتیں سناتیں۔ ابا مسکرا کر رہ جاتے۔

ایک مریض کو دیکھنے آتے تو سارے گھر کے مرض اُٹھ کھڑے ہوتے، کوئی اپنا پیٹ لئے چلا آرہا ہے تو کسی کی پھنسی چھل گئی۔ کسی کا کان پک رہا ہے تو کسی کی ناک سوجی ہوئی ہے۔

"کیا مصیبت ہے ڈپٹی صاحب! ایک آدھ کو زہر دے دوں گا۔ کیا مجھے سلوتری سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے جانور ٹوٹ پڑے۔" وہ مریضوں کو دیکھتے جاتے اور بڑبڑاتے جاتے۔

اور جہاں کوئی نئے بچے کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ وہ جملہ سامانِ تخلیق کو گالیاں دینے لگتے۔

"ہُنہ مفت کا ڈاکٹر ہے۔ پیدا کئے جاؤ کمبخت کے سینے پر کودوں دلنے کے لئے۔"

مگر جوں ہی درد شروع ہوتا وہ اپنے برآمدے سے ہمارے برآمدے کے چکر کاٹنے لگتے۔ چیخ چنگھاڑ سے سب کو بوکھلا دیتے۔ محلّے ٹولے والیوں کا آنا دشوار، بننے والے باپ کے آتے جاتے تڑاتڑ چپتیں اور جرأت احمقانہ پر پھٹکاریں۔

پر جوں ہی بچے کی پہلی آواز ان کے کان میں پہونچتی وہ برآمدے سے دروازے پر اور دروازے سے کمرے کے اندر آجاتے اور ان کے ساتھ ساتھ ابا بھی باولے ہو کر آجاتے۔ عورتیں کوستی پیٹتی پردے میں ہو جاتیں، زچہ کی نبض دیکھ کر وہ اس کی پیٹھ ٹھونکتے "واہ میری شیرنی!" اور بچے کا نال کاٹ کر نہلانا شروع کر دیتے۔ والد صاحب گھبرا گھبرا کر بھو ہڑ نرس کا کام انجام دیتے پھر اماں چلانا شروع کر دیتیں۔

"لو غضب خدا کا۔ یہ مردوئے ہیں کہ زچا خانے میں پلے پڑتے ہیں۔"

اور معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر کے دونوں ڈانٹ کھائے ہوئے بچوں کی طرح بھاگتے باہر۔

اور پھر جب ابا کے اوپر فالج کا حملہ ہوا تو رد پ چند جی ہاسپٹل سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور ان کی ساری پریکٹس، ان کے اور ہمارے گھر تک محدود

رہ گئی تھی۔ علاج تو اور بھی کئی ڈاکٹر کر رہے تھے مگر نرس کے اور اماں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی جاتے اور جب وقت سے وہ ابا کو دفنا کر آئے خاندانی محبت کے علاوہ انھیں ذمہ داری کا بھی احساس ہو گیا۔ بچوں کی فیس معاف کرانے، اسکول دوڑے جاتے۔ لڑکیوں بالیوں کے جہیز کے لئے گیان چند کا ناطقہ بند رکھتے۔ گھر کا کوئی خاص کام بغیر ڈاکٹر صاحب کی رائے کے نہ ہوتا۔ پچھی بازد کو توڑ واکر جب دو کمرے بڑھانے کا سوال اٹھا تو ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے سے دبا دیا گیا۔

"اس سے تو اوپر دو کمرے بڑھوا لو" انھوں نے رائے دی۔ اور اس پر عمل ہوا۔ مجن الیف اے میں سائنس لینے کو تیار نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب جوتا لے کر پل پڑے، معاملہ طے ہو گیا۔ فریدہ میاں سے لڑ کر گھر آن بیٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا میاں پہنچا اور دوسرے دن اس کی منجھلی بہو شیلا جب بیاہ کر آئی تو دائی کا جھگڑا ابھی ختم ہو گیا۔ بیچاری ہسپتال سے بھاگی آتی۔ فیس تو دور کی چیز ہے اوپر سے چھٹے دن کرتا ٹوپی لے کر آتی۔

پر آج جب چھبا لڑ کر آئے تو ان کی ایسی آؤ بھگت ہوئی جیسے مرد غازی میدان مار کر آیا ہے۔ سب نے ہی اس کی بہادری کی تفصیل پوچھی اور بہت سی زبانوں کے آگے صرف اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں وہ پندرہ اگست سے جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ترنگا جھنڈا اور اپنے گھر پر لیگ کا جھنڈا لگا تھا اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ ان دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی چوڑی خلیج حائل ہو گئی۔ جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنی غمگین آنکھوں سے

دیکھ دیکھ کر لرزا کرتیں۔ پھر شرنارتھیوں کا غلبہ ہوا۔ بڑی بہو کے میکے والے بھاول پور سے مال لٹا کر اور بہ مشکل جان بچا کر جب آئے تو خلیج کا دہانہ چوڑا ہو گیا۔ پھر راول پنڈی سے جب زبلا کے سسرال والے نیم مردہ حالت میں آئے تو اس خلیج میں اژدھے پھنکاریں مارنے لگے۔ جب چھوٹی بھابی نے اپنے بچے کا پیٹ دکھانے کو بھیجا تو شیلا بھابی نے جلدی سے نوکر کو بھگا دیا۔

اور کسی نے بھی اس معاملے پر بحث مباحثہ نہیں کیا۔ سارے گھر کے مرض ایک دم رک گئے۔ بڑی بھابی تو اپنے ہسٹریا کے دورے بھول کر لپا جھپ اسباب باندھنے لگیں۔

"میرے ٹرنک کو ہاتھ نہ لگانا" اماں کی زبان آخر کو کھلی اور سب ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا آپ نہیں جائیں گی؟" بڑے بھیا ترشی سے بولے۔

"نوج موئی میں سندھنوں میں مرنے جاؤں۔ اللہ ماریاں۔ بر کے پاجامے پھڑکاتی پھریں ہیں؟"

"تو سنجلے کے پاس ڈھاکہ چلی جائیے۔"

"اے وہ ڈھاکہ کاہے کو جائیں گی۔ کہیں کی مونڈی کاٹے بنگالی تو چاول ہاتھوں سے لبیڑ لبیڑ کے کھاویں ہیں۔" سنجھلے کی ساس ممانی بی نے طعنہ دیا

"تو راولپنڈی چلو فریدہ کے یہاں" خالہ بولیں۔

"توبہ میری، اللہ پاک پنجابیوں کے ہاتھوں کسی کی مٹی پلید نہ کرائے مٹ گئی دوزخیوں کی تو زبان بولے ہیں" آج تو میری کم سخن اماں پٹاپٹ

بول چلیں :-

" اے بوا تمھاری تو وہی مثل ہوگئی کہ اُدھ بچے کہ نیچے بھیریئے کے پیڑ تلے' بیٹی پیرا گھر نہ جانو۔ اے بی یہ کٹو گلہری کی طرح غمزہ مستیاں کہ بادشاہ نے بلایا۔ تو بھی بھم بھم کرتا .... ہاتھی بھیجا کہ چک چک یہ تو کالا کالا گھوڑا بھیجا چک چک یہ تو لاتیں جھاڑے کہ ....

باوجود کہ فضا مکدر سی تھی پھر بھی قہقہہ پڑ گیا۔ میری اماں کا منہ اور پھول گیا۔

" کیا بچوں کی سی باتیں ہو رہی ہیں " نیشنل گارڈ کے سردار اعلیٰ بولے " جن کا سر نہ پیر۔ کیا ارادہ ہے۔ یہاں رہکر کٹ مریں ؟ "

" تم لوگ جاؤ، اب میں کہاں جاؤں گی۔ میرا آخری وقت۔ "

" تو آخری وقت میں کافروں سے گت بنواؤ گی ؟ " خالہ بی پوٹلیاں گنتی جاتی ہیں اور پوٹلیوں میں سے سونے چاندی کے زیور سے لے کر ہڈیوں کا منجن، سوکھی میتھی اور ملتانی مٹی تک تھی۔ ان چیزوں کو وہ ایسے کلیجے سے لگاکر لے جا رہی تھیں گویا پاکستان کا اسٹرلنگ بیلنس کم ہو جائے گا۔ تین دفعہ بڑے بھائی نے جل کر ان کی پرانے روہڑ کی پوٹلیاں پھینکیں پر وہ ایسی چنگھاڑیں گویا یہ دولت نہ گئی تو پاکستان غریب ہو جائے گا۔ اور مجبوراً بچوں کے موت میں ڈوبی ہوئی گدیلوں کی روئی کے پلندے باندھنے پڑے۔ برتن بوروں میں بھرے گئے۔ پلنگوں کی پائے پٹیاں کھول کر جھلنگوں میں باندھی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جما جمایا گھر ٹیڑھی میڑھی گٹھریوں اور بقچوں میں تبدیل ہو گیا۔

تو سامان کے پیر لگ گئے ہیں اور قلانچیں بھرتا پھرتا ہے۔ ذرا ستانے کو بیٹھا ہے اور پھر اٹھ کر ناچنے لگے گا۔

پر اماں کا ٹرنک جوں کا توں رکھا رہا۔

"آپ کا ارادہ یہاں مرنے کا ہے تو کون روک سکتا ہے" بھائی صاحب نے آخر میں کہا۔

اور میری معصوم صورت کی بھولی سی اماں بھٹکتی آنکھوں سے گدلے آسمان کو تکتی رہیں، جیسے وہ خود اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کون مار ڈالے گا؟ اور کب؟

"اماں تو سٹھیا گئی ہیں۔ اس عمر میں عقل ٹھکانے نہیں" منجھلے بھائی کان میں کھسیائے۔

"کیا معلوم انھیں کہ کافروں نے معصوموں پر تو اور ظلم ڈھائے ہیں۔ اپنا وطن ہوگا تو جان و مال کا تو اطمینان رہے گا"

اگر میری کم سخن اماں کی زبان تیز ہوتی تو وہ ضرور کہتیں "اپنا وطن ہے کس چڑیا کا نام؟ لوگو! بتاؤ تو وہ ہے کہاں اپنا وطن، جس مٹی میں جنم لیا جس میں لوٹ پوٹ کر بڑھے پلے، وہی اپنا وطن نہ ہوا تو پھر جہاں چار دن کو جا کر بس جاؤ وہ کیسے اپنا وطن ہو جائے گا اور پھر کون جانے وہاں سے بھی کوئی نکال دے۔ کہے جاؤ نیا وطن بساؤ۔ اب یہاں چراغِ سحری بنی بیٹھی ہوں، ایک ننھا سا جھونکا آیا اور وطن کا جھگڑا ختم۔ اور یہ وطن اجاڑنے اور بسانے کا کھیل کچھ دلچسپی بھی تو نہیں ایک دن تھا مغل اپنا وطن چھوڑ کر نیا وطن بسانے آئے تھے۔ آج پھر چلو وطن بسانے

وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہوگئی، ذرا تنگ پڑی اتار پھینکی، دوسری پہن لی۔ مگر وہ خاموش رہیں اور ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ تھکا ہوا معلوم ہونے لگا جیسے وہ صدیوں سے وطن کی کھوج میں خاک چھاننے کے بعد تھک کر آن بیٹھی ہوں اور اس تلاش میں خود کو بھی کھو چکی ہوں۔

سر آئے پیر گئے۔ مگر اماں اپنی جگہ پر ایسے جمی رہیں جیسے بڑ کے پیڑ کی جڑ آندھی طوفان میں کھڑی رہتی ہے۔

پر جب بیٹے بیٹیاں بہوئیں، داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں پورا کا پورا قافلہ بڑے پھاٹک سے نکل کر پولیس کی نگرانی میں لاریوں میں سوار ہونے لگا تو ان کے کلیجے کے ٹکڑے اُڑنے لگے۔ بے چین نظروں سے انھوں نے خلیج کے اس پار بیکسی سے دیکھا۔ سڑک بیچ کا گھر اتنا دور لگا جیسے دور افق پر کوئی سرگرداں بادل کا ٹکڑا۔ روپ چندجی کا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ دو ایک بار بچے باہر نکلے مگر ہاتھ پکڑ کر واپس گھسیٹ لئے گئے۔ پر اماں کی آنسو بھری آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھ لیا جو دروازوں کی جھریوں اور چقوں کے پیچھے نمناک ہو رہی تھیں۔ جب لاریاں دھول اڑا کر قافلے کو لے سدھاریں تو ایک بائیں طرف کی مردہ حس نے سانس لی، دروازہ کھلا اور بوجھل قدموں سے روپ چندجی چوروں کی طرح سامنے کے خالی ڈھنڈھار گھر کو تاکتے نکلے اور تھوڑی دیر تک غبار کے بگولے میں بچھڑی ہوئی صورتوں کو ڈھونڈھتے رہے اور پھر ان کی ناکام نگاہیں مجرمانہ انداز میں، اجڑے دیار میں بھٹکتی ہوئی واپس زمین میں دھنس گئیں۔

جب ساری عمر کی پونجی کو خدا کے رحم وکرم کے حوالے کر کے اماں ڈھنڈھار

صحن میں آکر کھڑی ہوئیں تو ان کا بوڑھا دل ننھے بچے کی طرح سہم کر کھلا گیا جیسے چاروں طرف سے بھوت آن کر انھیں دبوچ لیں گے۔ چکرا کر انھوں نے کھمبے کا سہارا لیا۔ سامنے نظر اٹھی تو کلیجہ اچھل کر منہ کو آیا۔ یہی تو وہ کمرہ تھا جسے دولھا کی پیار بھری گود میں لانگ کر آئی تھیں۔ یہیں تو کمسن خوفزدہ آنکھوں والی بھولی سی دلھن کے چاند سے چہرے پر سے گھونگھٹ اٹھا۔ زندگی بھر کی غلامی لکھ دی تھی۔ وہ سامنے بازو کے کمرے میں پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور بڑی بیٹی کی یاد ایک دم سے ہوک بن کر کلیجے میں کوندگئی، وہ کونے میں اس کا نال گڑا تھا۔ ایک نہیں دس نال گڑے تھے اور دس روحوں نے یہیں پہلی سانس لی تھی۔ دس گوشت و پوست کی مورتیوں نے، دس انسانوں نے اسی مقدس کمرے میں جنم لیا تھا۔ اس مقدس کوکھ سے جسے آج وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے جیسے وہ پرانی کینچلی تھی جیسے کانٹوں میں الجھا کر وہ سب سناسٹ نکلے چلے گئے۔ امن اور سکون کی تلاش میں۔ روپیہ کے ۱۲ سیر گیہوں کے پیچھے اور وہ ننھی ننھی ہستیوں کی پیاری آغوں آغوں سے کمرہ اب تک گونج رہا تھا۔ لپک کر وہ کمرے میں گود پھیلا کر دوڑ گئیں، پھر ان کی گود خالی تھی وہ گود جسے سہاگنیں تقدس سے چھو کر ہاتھ کوکھ کو لگاتی تھیں، آج خالی تھی۔ کمرہ پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وحشت زدہ ہو کر وہ لوٹ پڑیں مگر چھپے ہوئے تخیل کے قدم نہ لوٹا سکیں۔ وہ دوسرے کمرے میں لڑکھڑا گئے۔ یہیں تو زندگی کے ساتھی نے پچاس برس کے نباہ کے بعد منہ موڑا تھا۔ یہیں دروازے کے سامنے کفنائی ہوئی لاش رکھی تھی۔ سارا کنبہ گھیرے کھڑا تھا۔ خوش نصیب تھے وہ جو اپنے پیاروں کی گود میں سدھارے پر زندگی کی ساتھی کو چھوڑ گئے، جو

آج بے کفنائی ہوئی لاش کی طرح لاوارث پڑی رہ گئی۔ بہیروں نے جواب دے دیا اور دہیں بیٹھ گئیں جہاں میت کے سرہانے دس برس ان کپکپاتے ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا۔ پر آج چراغ میں تیل نہ تھا اور بتی بھی ختم ہو چکی تھی۔

اور سامنے روپ چند اپنے برآمدے میں زور زور سے ٹہل رہے تھے گالیاں دے رہے تھے۔ اپنے بیوی بچوں کو، نوکروں کو۔ سرکار کو اور سامنے پھیلی ہوئی بے زبان سڑک کو، اینٹ پتھر کو اور چاقو چھری کو۔ حتیٰ کہ پوری کائنات ان کی گالیوں کی بمباری کے آگے سہمی دبکی بیٹھی تھی۔ اور خاص طور پر اس خالی گھر کو جو سڑک کے اس پار کھڑا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ، بجا دی ہو، وہ کوئی چیز اپنے دماغ میں سے جھٹک دینا چاہتے تھے۔ ساری قوتوں کی مدد سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے تھے مگر ناکام سے جھنجلا اٹھتے تھے۔ کینہ کی جڑوں کی طرح جو چیز ان کے وجود میں جم چکی تھی وہ اسے پوری طاقت سے کھینچ رہے تھے۔ مگر ساتھ ساتھ جیسے ان کا گوشت کھنچا چلا آتا ہو، وہ کراہ کر چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ایک دم ان کی گالیاں بند ہو گئیں، ٹہل تھم گئی اور وہ موٹر میں بیٹھ کر چل دیے۔

رات کو جب گلی کے نکڑ پر سناٹا چھا گیا تو پچھلے دروازے سے روپ چند کی بیوی دوپہر دسی ہوئی تھالیاں اوپر نیچے دھرے چوروں کی طرح داخل ہوئیں۔ دونوں بوڑھی عورتیں خاموش ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ زبانیں بند رہیں پر آنکھیں اب کچھ کہہ سن رہی تھیں۔ دونوں تھالیوں کا کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔ عورتیں جب کسی کی غیبت کرتی ہیں تو ان کی زبانیں کترنی کی طرح

چل نکلتی ہیں۔ پر جہاں جذبات نے حملہ کیا اور منھ میں تالے پڑ گئے۔

رات بھر نہ جانے کتنی دیر پریشانیاں اکیلا پاکر شبخون مارتی ہیں۔ نہ جانے راستے ہی میں تو سب نہ ختم ہو جائیں گے۔ آج کل تو اِکا دُکا نہیں پوری پوری ریلیں کٹ رہی ہیں۔ پچاس برس خون سے سینچ کر کھیتی تیار کی اور آج وہ دنیں نکالا لے کر نئی زمین کی تلاش میں افتاں و خیزاں چل پڑی تھی۔ کون جانے نئی زمین ان پودوں کو راس آئے نہ آئے۔ کمہلا تو نہ جائیں گے۔ یہ غریب الوطن پودے! چھوٹی بہو تو اللہ رکھے ان گنا مہینہ ہے۔ نہ جانے کس جنگل میں زچہ خانہ بنے۔ گھر بار نوکری، بیوپار سب کچھ چھوڑ کر چل پڑے ہیں۔ نئے وطن میں چیل کوؤں نے کچھ چھوڑا بھی ہوگا۔ یا یہ منہ تکتے ہی لوٹ آئیں گے اور جو لوٹ کر آئیں گے اور جو لوٹ کر آئے تو پھر سے جڑیں پکڑنے کا بھی موقع ملے گا یا نہیں۔ کون جانے یہ بوڑھا ٹھونٹ بہار کے لوٹ آنے تک زندہ بھی رہے گا کہ نہیں۔

گھنٹوں سڑن باولیوں کی طرح دیوار پاکھوں سے لپٹ لپٹ کر نہ جانے کیا بکتی رہیں پھر شل ہو کر پڑ گئیں۔ نیند کہاں؟ ساری رات بوڑھا جسم جو ان بیٹیوں کی کٹی پھٹی لاشیں، نو عمر بہوؤں کے برہنہ جلوس اور پوتوں نواسوں کے چیتھڑے اُڑتے دیکھ دیکھ کر تھراتا رہا۔ نہ جانے کب غفلت نے حملہ کر دیا۔

کہ ایک دم ایسا معلوم ہوا دروازے پر دنیا بھر کا عذر ڈھے پڑا ہے۔ جان پیاری نہ سہی پر بنا تیل کا دیا بھی بجھتے وقت کانپ تو اٹھتا ہی ہے اور پھر سیدھی سادی موت ہی کیا بے رحم ہوتی ہے جو اور پرے وہ انسان کا بھوت بنکر آئے۔ سنا ہے بڑھیوں تک کو بال پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھال چھل

کر ہڈیاں جھک آتی ہیں اور پھر وہیں دنیا کے وہ عذاب نازل ہوتے ہیں جن کے خیال سے دوزخ کے فرشتے بھی زرد پڑ جائیں۔

دستک کی گھن گرج بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک الموت کو جلدی پڑی تھی نا اور پھر آپ سے آپ ساری چٹخنیاں کھل گئیں۔ بتیاں جل اُٹھیں جیسے دور کنوئیں کی تہ سے کسی کی آواز آئی۔ شاید بڑا لڑکا پکار رہا تھا —— نہیں یہ تو چھوٹے اور سنجھلے کی آواز تھی۔ دوسری دنیا کے معدوم سے کونے سے۔

تو مل گیا سب کو وطن؟ اتنی جلدی؟ سنجھلا اس کے پیچھے چھوٹا۔ صاف تو کھڑے تھے، گودوں میں بچوں کو اٹھائے ہوئیں۔ پھر ایک دم سے سارا گھر جی اُٹھا —— ساری روحیں جاگ اٹھیں اور دُکھیاری ماں کے گرد جمع ہو گئیں چھوٹے بڑے ہاتھ پیار سے چھونے لگے۔ ایک دم سے خشک ہونٹھ میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ نکلیں، دفورِ مسرت سے سارے حواس تتر بتر ہو کر تاریکی میں بھنور ڈالتے ڈوب گئے۔

جب آنکھ کھلی تو نبض پر جانی پہچانی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔

"ارے بھابی مجھے ویسے ہی بلا لیا کرو چلا آؤں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو"۔ روپ چند جی پردے کے پیچھے سے کہہ رہے تھے۔

"اور بھابی آج تو فیس دلوا دو، دیکھو تمھارے نالائق لڑکوں کو لونی جنکشن سے پکڑ کر لایا ہوں۔ بھاگے جا رہے تھے بدمعاش کہیں کے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ کا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔"

پھر بوڑھے ہونٹ میں کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ

گئیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دو گرم گرم موتی لڑھک کر روپ چند جی کے جھریوں دار ہاتھ پر گر پڑے۔

سونے کا انڈا

رات کی تاریکی میں ایک باریک سی "ہُواں ہُواں" در و دیوار کو سوگوار بناتی ۔ رت جگا منانے والے کتّوں کے پُرسوز نالوں میں ڈوب گئی ۔" جیہ جیہ اللہ ماری پھر لونڈیا ——— پڑوسن نے ادوائن پہ اپنی ایڑیاں کھجاتے ہوئے کروٹ لی ۔

تجربہ کار بی بیاں اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتی ہیں ۔ آواز سُن کر ہی پتہ چلا لیا کہ بندو میاں پہ ڈگری صادر ہو گئی ۔ لڑکی ہوئی تو "ہُواں ہواں" اور لڑکا ہوتا تو "ہیاں ہیاں" ۔ مطلب یہ کہ لڑکی پیدا ہوتی ہے تو کہتی ہے کہ گھر کی دولت ہُواں (وہاں) چلی یعنی پرائے گھر ——— اور جو لڑکا آتا ہے تو اطمینان دلاتا ہے کہ دولت ہیاں (یہاں) لاؤں گا ۔ اور یہ سب دولت ہی کی تو دھوم دھام ہے ۔

" خدا کی مار پڑے اِن حرامزادیوں پر ۔ نگوڑیوں نے بندو میاں کا ہی گھر دیکھ لیا ہے ۔" سہ دری سے پڑوسن کی پڑوسن بولی " اگلے تو پکّی بات تھی

کہ بیٹا ہی ہوگا۔ پیر ہی ایسا پڑتا تھا بندو کی دلھن کا ——— بھئی اللہ کی دین تو منہ ہاتھ دیکھے نہ پاؤں ——— نو مہینے پار پڑ میلے ——— اب پھر جھاڑو پھری لونڈیا ———" پڑوسن بڑبڑائی کہ اتنے میں زچگی والے گھر سے سڑپڑ دو وڑنے اور دبی گھٹی ہائے توبہ کی آواز نے پڑوسنوں کو اپنی کھری چارپائیاں اور سینوں سے لٹکتے ہوئے بچے چھوڑ کر دیواروں پر چڑھ جانے پر مجبور کر دیا۔

دیوار کے اس پار صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ دہلیز پر بندو میاں کی ماں بھسکڑ ا مارے بیٹھی نکمّی بہو کی سات پشت کو گالیاں دے رہی تھیں "موئی ہیجڑوں کے خاندان کی ——— لونڈیا نہ جنے گی تو اور کیا کرے گی۔"

صحنچی کے سامنے پڑی ہوئی کھاٹ پر بندو میاں سر پکڑے ایسے بیٹھے تھے جانو ڈاکو ان کے گھر میں کوٹل بھوڑ کر ور آئے ہیں اور ان کی نو مہینے کی جمع پونجی کو آگ لگا کر ایک راکھ کا ڈھیر بنا گئے ہیں۔ یہ تیسرا گھاؤ تھا ان کی جانِ حزیں پر۔ ایک سہا ——— دوسرا سہا ——— پر اس تیسرے چر کے نے تو ان کی کمر دوہری کر دی۔ ایک نہیں تین بیٹیاں ایسی دھسی ہوئی چھاتی پر تین پہاڑ ——— تین باراتیں ——— تین دولھاؤں کے سونخرے ——— تین جہیزوں کے تین ہزار طنطنے۔ جیسے تین لمبی ناگنیں ان کی گردن کی طرف زبانیں لپلپاتی بڑھی چلی آرہی ہوں۔ رہ رہ کر ایک دبی ہوئی خواہش پھن اٹھاتی کہ ایک بار جی کڑا کرکے ان تینوں ناگنوں کا گلا

گھونٹ ڈالیں۔

جب پہلی بار یہی سانحہ ہوا تھا تو وہ کچھ کھسیا کر رہ گئے تھے۔ یار لوگوں نے پھبتیاں کسی تھیں سو بھی کڑوی مسکراہٹ میں چھپا گئے تھے۔ دو چار عنایتیں جو بیٹے کی آس پر بیوی کے لئے بطور انعام اکٹھا کر رکھی تھیں وہ گول کر گئے۔ مگر پھر اس مزدور کی طرح جو ایک کنواں کھودے۔ زمین کے کلیجے میں ہاتھ ڈال کر چلّو بھر پانی اٹھائے اور وہ کھاری نکل جائے تو کلّی کر کے پھر دوسرے کنوئیں کی داغ بیل ڈال دیتا ہے —— انھوں نے بھی نہایت بے صبری سے داغ بیل ڈالدی —— ایک نئے ارمانوں کا نیا بیج بو ڈالا۔

اور یہ نیا بیج اس بار پھر الٹا اگ گیا۔ بہتیرا جھنجلائے۔ گالیاں، گھونسے، لات، سب ہی کچھ استعمال کیا اور پھر ہمت بھی نہ ہاری۔ اللہ کا بندہ کوشش پر آمادہ ہوگیا کہ اب کے تو جان توڑ کر ایک ایسا بیج بو ڈالے جس کے تناور تنے سے پیٹھ لگا کر زندگی کی بھاگ دوڑ میں ایک گھڑی کو سستا سکے جس کی گھنیری چھاؤں میں ایک بار تھکے ماندے پیر پھیلا سکے۔ آخر دنیا میں کچھ تھوڑا سا سہارا کچھ تھوڑی سی چھاؤں اس کے حصے کی بھی تو تھی مگر نہیں اس کے نصیب میں تو بس کانٹوں بھری جھاڑیاں ہی تھیں۔ ایک نہیں تین تین۔

"ارے اپنے رسول اللہ کی بھی تو بیٹیاں ہی تھیں۔ جنّتی ہوتا ہے بیٹیوں کا باپ"۔ لوگوں نے چاہا بندو میاں کے زخموں پر ذرا فردوس بریں کی مقدس ہواؤں کے پھائے رکھیں۔ شاید کچھ حورانِ بہشتی کی عنبریں

زلفوں کا خیال مشام جاں کو فرحت بخشے۔ زمرد کے محلوں کی جگمگاہٹ اس کے کچے مکان کی غلاظتوں کو ڈھانک سکے ــــــ دودھ اور شہد کی نہروں کا تصور شاید اس تلخی کو زائل کر سکے۔ جو بوسیدہ اناج۔ بدبودار نیل اور باسی ترکاریوں کی عنایت سے حلق میں۔ مخمل و کمخاب کے خواب ان گھسے پھٹے چیتھڑوں میں رفو کر سکے۔ ویسے بھی اللہ پاک اپنے پیارے بندوں کو دنیا میں دکھ پہنچا کر ان کا امتحان لیا کرتا ہے۔ پتہ نہیں۔ اسے اس قسم کی امتحان بازی میں کیا لذت ملتی ہے۔ کاش ان احمقانہ باتوں میں پڑنے کے عوض وہ جی لگا کر خدائی کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل اس پیشے سے اکتا چکا ہے اور اسے بھی کڑے امتحان لینے ــــــ مصیبت جھلوانے ــــــ اور اپنے لاڈلے بندوں کو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط پر نٹ بازی کروانے کا چسکا پڑ گیا ہے۔

مگر بندو میاں اس وقت رات کے تین بجے جبکہ ایک عدو لڑکی ان پر قسمت نے اور داغ دی تھی جنتی بننے کو بالکل تیار نہ تھے۔ حور ان بہشتی کی صورت سے انھیں قے آ رہی تھی کیوں کہ وہ اس جنس کے ہاتھوں بے طرح ستائے گئے تھے۔ جب ایک کالی دبلی اور بے بس لڑکی ہی ان کے کہے پر نہ چل سکی اور ایک ٹوٹا پھوٹا لونڈا بھی پیدا نہ کر سکی تو بھلا وہ نخریلی حوریں اس کا کلیجہ کیا ٹھنڈا کر سکیں گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ان تین ننھے منے حلقوں کو جو ان کے چاروں طرف منہ پھاڑے گھوم رہے ہیں،

بھلا کیا تر کر سکیں۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ یاقوت اور زمرّد کے محل قطعی ان کے ہاتھ نہ آسکیں گے۔ وہاں بھی یہی دھاندلی ہوگی۔ بڑی بھاری پگڑی ہوگی جو ان کے باپ سے بھی نہ بھری جا سکے گی۔

اور تاریک کوٹھری کے سب سے تاریک کونے میں ملزمہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے ان تینوں پہاڑوں کو دیکھ رہی تھیں، انھیں اپنے رحم میں اپنی ممتا کی چھاؤں میں پروان چڑھایا تھا، ان میں اپنی جوانی کا گرم گرم خون نچوڑا تھا ——— تین بار اس نے اپنے تئیں پھاڑ کر ایک نیا انسان جنا تھا تین بار خود کو مٹا کر پھر سے بنایا تھا۔

پر نہ جانے کون سی چوک ہوگئی کہ ہر بار پھل کڑوا ہوگیا ——— ہر بار نوالہ کیچڑ میں گر پڑا ——— اور پھر سیاہ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس نے تین پہاڑوں کو اپنی چھاتی کی طرف پھسلتے دیکھا اور ہچکیوں سے اس کا تھکا ہوا جسم ٹوٹنے لگا۔ کڑوے کڑوے آنسو اس کے زخمی ہونٹوں پر تیزاب کی طرح چبھنے لگے ——— کبھیلن کا درد پیچ و تاب کھا کر اٹھا اور جسم کے دکھوں نے ذہنی دکھوں کو پرے ڈھکیل دیا۔ یہ پیدائش کے بعد کی ہٹیں دردِ زہ سے کچھ کم نہیں ہوتیں۔

جب درد کا چکر دھیما پڑا تو اُسے بے اختیار پہلوٹھی کا پہلا درد یاد آگیا۔ وہ عجیب قسم کا جیتا جاگتا درد جس کی جس کی ننھا مُنا مہمان تار کے ذریعے سے اطلاع بھیجتا ہے جسے وصول کرتے ہی اس پر خوف و مسرّت کے وہ عجیب و غریب جذبات طاری ہوگئے تھے، جن کی کوئی تشریح نہیں۔

جن کو کسی دکھ کسی سکھ یا کسی دوسرے احساس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی جو صرف ایک ماں کی سزا ——— ماں کا انعام اور ایک ماں کی دولت ؟

مگر وہ بڑی نادان تھیں۔ پہلے ہی درد پر بیٹے کو گود میں لینے لپکی ——— چشم زدن میں اسے چھاتی سے لگا بھی لیا ——— گھر شادیانوں سے گونج اٹھا۔ شہدوں نے محلہ سر پر اٹھا لیا۔ مہترانیاں لہک لہک کر گانے لگیں۔ اور وہ دلھن بن کر بیٹھنے سے دولھا کو گود میں سنبھالے صحن میں تارے دیکھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے آنگن میں جھنڈولا جھم جھم کھیلنے لگا۔ دادی دادا کے بوڑھے دل جاگ اٹھے ——— لو وہ چوڑی چھاتی کا جوان اکھاڑے میں کود پڑا ——— مسیں بھیگیں ——— مونچھوں کا کونڈا ہوا ——— ——— اے لو دیوانہ پن تو دیکھو مسلمانیاں بھول ہی گئی ——— توبہ۔

اگر درد کا منہ زور حملہ یکایک نہ ہو جاتا تو وہ پہلے اس مقدس فرض سے سبکدوش ہو جاتی۔ خیر جب لہریں ساحل سے دور ہٹیں تو اللہ رکھے سب کام کاج پورے ہو چکے تھے۔ اور اب کماؤ پوت روپوں کی تھیلی جھنکارتا دہلیز نا ندر رہا تھا۔ کھن کھن کرتے گول گول چاندی کے ٹکڑے سارے گھر میں ٹھنکنے لگے۔ دو چار بھڑک کر بوڑھی دادی کی جھولی میں بھی جا پڑے۔ دو چار اچک کر دادا کی داڑھی میں بھی ستاروں کی طرح ٹمٹمانے لگے۔ واہ یہ خوب دکھ بھری بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ ماں کا حق پہلے ——— دردوں کا معاوضہ پہلے ——— گوشت پوست کی قیمت پہلے اور وہ لمبے لمبے ہاتھ مار کر کھیتی کاٹتی ہی رہی کہ دردوں نے تو چل میں آنا شروع کر دیا۔

گنتی کی چند سانسوں کے درمیان اس نے سوچا کہ کماؤ پوت کے لئے بہو بیاہ کر لائے یا نہیں؟ کیونکہ بہو آگئی تو ڈال ادھر ہی جھکنے لگے گی پھل اُدھر ہی زیادہ ٹپکیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ بہو لانے کا فیصلہ کرتی ——— اڑا اڑ دھم ——— بیٹی آگئی۔ کھن کھن کرتے سارے روپہلی ستارے چوہے بن کر بلوں میں گھس گئے۔ روپوں کی تھیلی لوٹ پوٹ کر خالی ٹھیکرا بن گئی۔

دادا کی سفید داڑھی پر اوس پڑ گئی اور دادی کے ارمانوں کا شیرازہ ہوا میں اڑ گیا۔ دائی ماں موٹی موٹی گالیاں عورت ذات کے جنم میں تھوکنے لگی اس کا بس چلتا تو وہ ایک سرے سے عورت کی پیدائش کا گلا ہی گھونٹ دیتی اس کا بیج ہی دنیا سے مٹا دیتی۔ اللہ ماری رات کے تین بجے اور پھر خاک پڑی اور نصیبوں جلی لونڈیا ——— اور پھر نصیبوں جلی لونڈیا ——— اور پھر نصیبوں جلی لونڈیا۔

پھر نہ جانے ایک دم سے اس کے جی میں نہ جانے کیوں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ گیہلین کا درد غم و غصے کے بہاؤ میں بہ گیا۔ غرور سے اس نے تکئے پر سرک کر سر اونچا کر لیا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ——— وہ بانجھ نہیں، بنجر نہیں۔ پھر یہ اداسی کیوں۔ اس نے کس کی جاگیر چھین لی۔ کس کی دولت چھین لی ——— جس کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے گائے بیاتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا، بیٹی ہے کہ بیٹا۔ سب دودھ دوہنے لگتے ہیں۔ مرغی انڈا دیتی ہے تو اسے پیار سے دانہ ڈالتے ہیں۔ پر جب عورت

حاملہ ہوتی ہے تو لوگ اس سے سونے کا انڈا دینے کی کیوں فرمائش کرتے ہیں؟ اور اگر وہ سونے کا انڈا نہ دے سکے تو ——— تو گھر میں موت ہو جاتی ہے۔ امیدوں، آرزوؤں کے جنازے اٹھنے لگتے ہیں اور دنیا غریب ہو جاتی ہے۔

پھر اسے اپنے تینوں گندے بے مصرف انڈوں کا خیال ستانے لگا۔ بے اختیار جی بھر آیا اور آنکھوں میں دھواں اٹھنے لگا۔ جی چاہا کہ اپنے تینوں کلیجے کے ٹکڑوں کو اٹھا کر اس گھر سے، اس گلی سے ——— اس شہر سے بلکہ اس دنیا سے بھاگ جائے۔ وہاں، جہاں اس کے جگر گوشے دولت کی ترازو میں نہ تولے جائیں جہاں سب سونے کے انڈے ہوں ——— کوئی گندے انڈے کی خندق میں نہ ڈالا جائے۔ جہاں اس کی ننھی گڑیاں جائز داشتاؤں کی خدمت انجام دینے کے بدلے عورت، ماں بیٹی اور بیوی کا رتبہ حاصل کر سکیں۔ جہاں عورت کی تخلیق عذابِ جان نہ ہو۔ جہاں لڑکیوں کی براتیں بھوت بن کر ماں باپ کے سینوں پر نہ چڑھتی ہوں، جہاں بیٹیوں کا جہیز ماں باپ کی کھال نہ اُتارے۔ جہاں اولاد سے والدین محبت کریں۔ اولاد سمجھ کر زر جاگیر سمجھ کر نہیں۔

اس کا جی چاہا لپک کر اُٹھ بیٹھے اور باہر جا کر سوگ منانے والے میاں کا مُنھ نوچ ڈالے اور اسے جھنجھوڑ کر کہے "تمھیں غم ہے۔ صدمہ ہے کہ میں نے تمھارے بیج سے کٹیلا جھاڑ اُگا یا۔ مگر غور سے دیکھو۔ کیا یہ تمھاری ہڈی نہیں۔ تم ڈر رہے ہو کہ تمھیں اس کی سچائی تو کرنا پڑے گی مگر پھل نہ

ملیں گے۔ آج اگر بیٹا بیٹی کے بدلے سونے کے توڑے جن دیتی تو تم یوں منہ سپھلا کر کبھی نہ بیٹھتے۔

مگر اتنے میں اس نے دیکھا کہ ایک بھیانک سایہ اس کے پلنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خوف سے اس کی رگیں کھنچنے لگیں۔ آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی، بندو میاں نوزائیدہ بچی پر جھک گئے۔

"شوکت۔ حشمت —— اور اس کا نام —— رحمت"

کیوں ٹھیک ہے نا؟" انھوں نے بچی کے پھول سے نرم رخسار کو انگلی سے چھُوا اور مسکرانے لگے۔ آج نہ ان کے چہرے پر کھسیان پن تھا اور نہ آنکھوں میں ملامت۔ نہ ان کے انداز میں از سر نو پیغام تھا نہ جھوٹی امیدوں کے غیر مطمئن سایے۔ جیسے وہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر کسی بڑے دشمن سے جیت کر آئے ہیں۔

رد ہانسی ماں نے غرور سے شوکت حشمت اور رحمت کو دیکھا دنیا کی ماؤں کو دیکھا —— ان پہاڑوں کو دیکھا جن کے دامن میں زندگی کی ہریالیاں انگڑائی لیتی ہیں۔ جن کے آنچلوں میں مہر و الفت کے پھول کھلتے ہیں۔ جن کے سینوں سے امرت ٹپکتا ہے۔ جن کی گودوں میں علم و حکمت ہمکتا ہے —— فلسفہ آغوش بھرتا ہے اور فنونِ لطیفہ کلکاریاں مارتے ہیں۔ جہاں بسورتی زندگی چمکاری جاتی ہے اور سوئی انسانیت جگائی جاتی ہے —— اُچاٹ

نیندیں منائی جاتی ہیں۔ روتی آنکھیں ہنسائی جاتی ہیں اور بکھرے موتی سمیٹے جاتے ہیں —— دنیا بنتی بگڑتی ہے —— یہاں انسان ڈھلتے ہیں۔

کچے دھاگے

آج گاندھی جینتی ہے ۔ شہر میں کتنی چہل پہل ہے ۔ پھولوں اور ترنگے جھنڈوں سے آراستہ پیراستہ موٹریں اپنی آغوش میں توندو لیتے، سیٹھوں کو دبلائے فراٹے بھر رہی ہیں برف جیسی سفید کھدّر میں یہ آبنوس پتلے کلّے سفید کا چتکبرا ملاپ آنکھوں پر کیسی تکلیف دہ چوٹ کرتا ہے ۔ اور ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی بدذوق سیٹھانیاں اور غل مچاتے ہوئے بچے "سونے پر سہاگہ" کا کام کر رہے ہیں ۔ دولت بنا کہے سُنے ان پر لوٹ پڑی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ بہت سے بے ہنگم تھان کسی نے اٹھا کر موٹروں میں ٹھونس دیے ہیں ۔ سامان آرائش، رنگ و پوڈر، الماریوں سے کود کر اُن پر آن پڑا ہے ۔ ناک بہتے تیل میں چپچپاتے بچے وائٹ اَوے کی الٹرا موڈرن فراکوں کے ساتھ جب جھاگھن کرتے پہنے .... آنکھوں میں منوں کاجل اُنڈیلے ۔ عجیب مضحکہ خیز ہیُولی بنے ہوئے ہیں ۔ ہاتھوں میں ترنگے جھنڈے ہیں اور امریکن کھلونے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی سستے سرکس کا

کا اشتہار چلا جا رہا ہے۔

آج باپو کا جنم دن ہے نا۔ آج بھارت کے سپوت نے بھارت نواسیوں کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے دھرتی پر پہلا سانس لیا تھا۔ مگر پریل اور لال باغ کی چالوں میں یہ کیسی مردنی چھائی ہوئی ہے جیسے آج ان کا کوئی نہ پیدا ہوا ہو، بلکہ ہزاروں موتیں ہوگئی ہوں۔ لاکھوں اُمیدیں دھواں بن گئی ہوں۔ ان کے چہروں کی رونق کہاں غائب ہوگئی ہے کیا یہ کبھی واپس نہ آئے گی؟ ان کے کپڑوں میں رنگ کیوں نہیں طلعے کی چمک کیوں نہیں ان کے ہاتھوں میں ترنگے غبارے کیوں نہیں؟

باپو تو جنتا کے تھے۔ پھر یہ چور بازاریوں ہی کے ہتھے کیوں چڑھ گئے۔ جیسے پرانے زمانے کے دیوتاؤں کو چھین لیا تھا، ایسے ہی انھیں بھی لوگ اُڑا لے گئے اور شوکیس میں سجا دیا۔ تجوریوں پر منڈھ دیا۔۔۔۔۔۔ لین دین کی ترازو کے پلڑے میں بگھری بنا کر ڈال دیا ہے۔ انھیں مٹھائی اور بسکٹ کے ڈبوں پر چپکا دیا ہے۔ جوتوں کے اشتہار پر ٹانگ دیا ہے۔ ان کا نام لے کر چندے جمع کرتے ہیں۔ ان کا نام لے کر ہڑتالیں توڑتے ہیں، انھیں کا بہانہ کر کے کنٹرول ہٹاتے ہیں اور کالے بازار کو سینچتے ہیں۔ ان کے بنا کوئی دھندہ نہیں چلتا۔ جانو ترپ کا اکا ہاتھ آگیا ہے، ہر داؤ پر وہی لگا دیتے ہیں۔ اب شاید انھیں کے نام پر اَہنسا کے اصولوں پر تیسری جنگ کا خون بھڑکا جائے گا۔

آج اہنسا دادی ان کی یاد میں آتما کو شدھ کرنے کے لئے سوت کات رہے ہیں۔ بڑے بڑے منسٹر چوٹی کے افسر، ملوں کے مالک سٹے اور چور بازاروں کے بیوپاری، ایک محاذ پر اکٹھے ہو کر آتما کو شدھ کر رہے ہیں۔ دو سال کے عرصے

میں کتنی بہت سی آتمائیں ناپاک ہو چکی ہیں، ان کے لئے اس سوت کے تانے بانے سے ایک سائبان بُنا جائے گا جس کی چھاؤں میں نچنت بیٹھکر یہ پھلتے پھولتے رہیں گے۔

میرے ماموں جان بھی اپنے ڈرائنگ روم میں صوفہ پر نیم دراز صبح سے تکلی سنجا رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر کیسا مقدس عزم چھایا ہوا ہے، جا نو پل صراط بن رہے ہیں جس پر چل کر انھیں سورگ میں جانا ہے۔ نہ جانے وہ اس کچے سوت کے پھندے سے کیا کچھ پھانس لینے کی تکڑم لگا رہے ہیں۔

کبھی وہ برٹش سرکار کے فرزند دلبند رہ چکے تھے لیکن چیونٹی کی طرح طوفان کی خبر پا کر جلدی سے نمک کی ستیہ گرہ میں کود پڑے اور نمک بنانے لگے۔ جب وہ یوں "گمراہ" ہوئے تو ان کے والد صاحب نے انھیں عاق نہیں کیا بلکہ بیٹے کی دانشوری کی داد دی۔ وہ خود سرکار سے وابستہ رہے مگر ان کا بیٹا باغی ہو گیا۔ جبھی تو آج وہ دیسی سرکار کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں۔ بیس سال محکمۂ تعلیم کی اصلاح کرنے کے بعد وہ اب "کمیونسٹوں کو مارو" والی اسکیم میں بڑی شدو مد سے حصہ لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

تکلی سنجاتے جاتے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ بھنگیوں کی ہڑتال طالبعلموں کی مدد سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہ وار خالی گیا۔ اب طالبعلموں کی ہڑتالیں کس کی مدد سے تڑوائی جائیں۔ تالی بجنے کے لئے دو ہاتھوں کا ہونا ضروری ہے۔ سر لڑانے کے لئے دو سروں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا طالب علموں کے دو ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے؟ ماموں جان زہر کا توڑ زہر ہی سے کرتے ہیں اس لئے طالب علموں کی ایک

صحیح نمائندہ جماعت کی پیداوار میں منہمک ہیں جو جی توڑ کر قومی گیت گانے فیس بڑھانے پر سرکار کی بے پناہ مہربانی کا شکریہ ادا کرے اور کمیونسٹوں کے بہکاوے میں آکر ملک کا تختہ نہ الٹے بس پھر ہڑتالیں بند ہو جائیں گی۔ ادھر تکلی ناچ رہی ہے، ادھر وزیر اعظم پردیسیوں سے ناطہ جوڑ آئے ہیں، وہاں سے تحفہ لائیں گے جن کی مدد سے بھوک کے ساتھ ساتھ بھوکوں کا بھی صفایا ہو جائے گا۔

ادھر میرے نانا جان انھیں رشک آمیز نظروں سے تک رہے ہیں۔ وہ صبح سے بیٹھے جوجھ رہے ہیں پر تکلی ان کے تکلے سے بل نکالے دے رہی ہے۔ روئی کا ٹکڑا پسینہ میں ڈوب کر چوہے کی شکل کا ہو گیا ہے۔ تین تکلیاں بدل چکے ہیں پر ہر نئی تکلی انھیں نیا ناچ نچا رہی ہے۔ وہ اکڑوں بھی بیٹھے پالتی بھی ماری دو زانوں ہوئے پھر ماموں جان کی طرح نیم دراز بھی ہو گئے مگر ان کی طرح نرت بھاؤ نہ جما سکے۔ کوئی تکلی بھی ماموں جان کی تکلی والا بھرّاٹا نہیں بھر پاتی۔

وہ جھنجھلاتے ہیں تب ماموں جان مسکراتے ہیں۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں "قبلہ ریاض کی ضرورت ہے ریاض کی۔ یہ مرتبہ یوں بلا تپسیا کیے ہاتھ نہیں لگ جایا کرتا۔ جہاد کے لیے تلوار پکڑنے کی آرزو مند انگلیاں بھلا تکلی کو پکڑنا کیا جانیں۔ آپ توپ تفنگ کے عادی ٹھہرے، یہ روحانی تلوار یعنی تکلی گھمانا کیا جانیں۔

میرے نانا جان ان کی آنکھوں کی بات چیت سمجھنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ فوراً ان کے گھٹنے لرزنے لگتے ہیں، ویسے ہی ان کی گھبراہٹیں مالیخولیا کی حدوں کو چھو رہی ہیں، جب سے سنا ہے کہ ہندستان اور پاکستان دونوں

جگہ ان کی تجارت کھنڈت میں پڑنے والی ہے بالکل ہی حواس باختہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا ایک پیر ہندستان میں ہے تو دوسرا پاکستان میں۔ یہاں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا واسطہ دیتے ہیں تو وہاں اسلام کی دہائی۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ نانا جان کی چیخ و پکار میں کوئی دم نہیں رہا دونوں ملک ایک دوسرے سے دور کھسکتے جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ میرے نانا جان کے دونوں پیروں کے درمیان کا فاصلہ خطرناک حد تک دور ہوتا جا رہا ہے بیچ میں سے چر جانے کا کرب ان کی رگ رگ میں رچ گیا ہے۔ دکھ اور خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھیں وہ گاندھی جی کے اس مجسمے کی طرف پھیر دیتے ہیں جو بنگلہ کے بیچوں بیچ نصب ہے۔ اور ہر آنے جانے والے کو جتا کر نانا جان وہاں روز پھول چڑھا کر ڈنڈوت کرتے ہیں۔

ماموں جان پر انھیں رشک نہیں آتا۔ اب تو جادوگری کا بھی شبہہ ہونے لگا ہے۔ وہ کیسی دلیری سے بیٹھ کر افسروں کے بیچ میں وزیر اعظم پر چھینٹے بازی شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے بوکھلانے اور ایک دم بپھرنے کے قصے سنا سنا کر کیا مزے سے قہقہے لگاتے ہیں اور لگواتے ہیں۔ کانگریس مہادیویوں کا تو بالکل گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح ذکر کرتے ہیں۔

تو بالکل گدھا ہے، ایک مہادیوی نے ایک بار میرے ماموں جان سے کہا تھا اور اس وقت انھیں اپنی خوش نصیبی پر فخر ہوا تھا اور آنکھوں میں مارے عقیدت کے آنسو ابل آئے تھے۔ اب بھی بعض موقعوں پر جب وہ قصہ سناتے ہیں تو انکی آنکھوں میں آنسو ابل آتے ہیں۔ نانا جان اس روحانی رشتے کی متبرک

لطافت پر جھوم جھوم اٹھتے ہیں، پر دُکھ سے تلملا جاتے ہیں۔ کاش انھیں بھی کسی نے پیار میں گدھا یا کتّا کہا ہوتا تو وہ آج کتنی بہت سی زحمتوں سے بچ گئے ہوتے۔ مگر ایک بار قائداعظم کے جلوس کا اونٹ بننے کے بعد کسی اور اصطبل میں تو ان کے لئے جگہ ہی نہیں اور آج باپو کی جینتی کے موقع پر تکلی کے نخرے بڑے کھل رہے ہیں۔

وہ سوت کاتتے جا رہے ہیں اور اس میں موٹی موٹی گالیاں پروتے جا رہے ہیں، مگر وہ جانتے ہیں یہ اڑیل سوت ان سے شرط باندھ کر مقابلہ کر رہا ہے مروڑیاں دیتے دیتے ان کی چٹکیاں تھک چکی ہیں۔ پورے مہلا رہے ہیں۔ پر سوت مجال ہے جو کمبخت دو اینچ سے آگے کھسک جائے جبھی تو وہ اس میں مغلظات کی گرہیں جڑتے جاتے ہیں۔ یہ سوت وہ عید الضحیٰ کے موقع پر وزیر اعظم کی گردن میں مالا بنا کر حمائل کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی کاوشوں سے انھوں نے مسلمان محلوں میں لوگوں کو اونچ نیچ دکھا کر وزیر صاحب کو مدعو کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جب کبھی تار ٹوٹتا ہے تو ان کا جی چاہتا ہے کہ ایک دم حج کو چلے جائیں اور وہاں درِ حضورؐ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے ایک مستقل مراقبہ میں چلے جائیں۔ مگر ایک دم انھیں ہندستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے کاروبار کا خیال اس مراقبہ سے چونکا دیتا ہے۔ اور وہ سہم کر چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں ماموں جان کا کوئی چھوٹا سا تو اں احساس ان کے دل کا چور نہ پکڑ لے۔ نہیں تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔

اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے رُدر ی ل جی کی تکلی بھی کچھ تال سُر سے

نہیں ناچ رہی ہے۔ چکریاں لیتے لیتے ایک دم سے توڑے لینے لگتی ہے اور پھر تیوہ۔ اکر تار بھی توڑ دیتی ہے مگر رو ڑی لال جی ہمت نہیں ہارتے۔ ملک میں بڑی افراتفری پڑی ہے۔ جدھر دیکھو بے ایمانی، دھوکہ بازی۔ باپو کی تعلیم کو بھول کر سب لوٹ کھسوٹ برتتے ہوئے ہیں۔ ایسے میں کوئی ایمانداری کا بیوپار کرے تو کیسے کرے۔ ایمانداری چلے گی کتنے دن کھلے بازار میں دھرا ہی کیا ہے؟ مال کو بازار نہیں ملتا، بازار کو گاہک نہیں ملتے۔ جب مال کوٹھوں میں پٹا سڑ رہا ہے تو مزدور کو کوئی مزدوری کہاں سے دے۔ نیتا کہتے ہیں مال کی پیداوار بڑھاؤ، سو بڑھ گئی۔ اب نیتا یہ نہیں بتاتے کہ گاہکوں کی پیداوار کیسے بڑھائیں؟ کاش "خوراک اگاؤ" کا نعرہ مارنے کے بجائے "خریدار اگاؤ" کی اسکیم چلا سکتے۔ مگر خریدار کا بیج سوائے امریکہ کے کہیں نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ نے تو کیا مزے سے سارے ملکوں میں ڈالر بو کر خریداروں کے کھلیان قائم کر دیے ہیں۔

پر ان سب باتوں کی ذمہ دار آتما کی گندگی ہی تو ہے۔ چرخہ ہی تو بھارت کا ایٹم بم ہے۔ سوت کات کات کر انگریزوں کا الّو کر دیا تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے۔ جب آتما شدھ ہو جائے گی پھر یہی سوت کا جال سمندر سے مچھلیوں کی طرح ان گنت گاہک پکڑ لائے گا۔ یہی کچے دھاگے اس دیو کا بھی بند بند جکڑ لیں گے جو کردٹ لے کر چونک رہا ہے۔ سب دکھ دور ہو جائیں گے۔

زنان خانہ میں مسانی بھی بیٹھی تکلی کو متھ کر اپنے جیون کا امرت نچوڑنے پر جٹی ہوئی ہیں۔ باوجود کوششوں کے وہ کھدر نہ پہن سکیں۔ ان کا اطلس اور کمخواب

کی آغوش میں پلنے والا جسم کھدر کے گھسے نہ سہار سکا اور ہمیشہ پھپھوند اٹھتا۔ گرمی دانے پھنسیاں اور پھر پھوڑے بن جاتے۔ یہ رائی کے پہاڑ دیش سیوکا کو مرہم کا چھپایا تا ہوا پھایا بنا دیتے۔ کچھ دن تک تو ماموں جان نے ان کے جسم کے زمینداری ٹھسوں کو نہ گردانا، مگر جب ڈاکٹروں نے مریضہ کو سوائے باریک ململ کے دوا میں ڈوبے ہوئے پھایوں کے جملہ ستر پوشی ہی سے منع کر دیا تو وہ مجبوراً اس شدھی سے باز آگئے ویسے بھی ٹنکچر اور آئوڈوفارم کے حملے جھیلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد وہ انھیں تیسرے درجے کا نیشنلسٹ سمجھتے ہیں اور ایسے حقارت سے دیکھتے تھے جیسے ایک پہنچا ہوا پیر مرشد کسی مبتدی کو دیکھتا ہے۔

ممانی بھی تکلی گھما رہی ہیں مگر ان کی انگلیاں لرز رہی ہیں۔ ان نازک تاروں میں ان کے جذبات کی ہلچل کو سہارنے کی سکت نہیں۔ کیونکہ مس راج کی انگلیاں بھی تو قابو میں نہیں۔ ماموں جان کے گھر کے سارے ساز و سامان کی طرح آج ان کی پرائیوٹ سکریٹری بھی شدھ ہونے کا پختہ ارادہ کر کے ماموں جان سے تکلی چلانا سیکھ رہی ہے۔

مس راج کی عمر کا ابتدائی حصہ یتیم خانہ میں گزرا جہاں وہ یسوع مسیح کے مجسمے کے سامنے خدا کی برکات کی حمد گاتی رہی۔ کھردرے، بدرنگ کپڑے پہن کر اور ناقص کھانے کھا کر اس نے خدا کی عنایات کی داد دی۔ یتیم خانے سے نکل کر وہ سیدھی فوج کے دفتر پہونچ گئی۔ جنگ کے یہ چند پُر بہار سال اس کی زندگی میں روشن ستاروں کی طرح ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔ وہ سیر سپاٹے، وہ رقص و سرور کے جگھمٹے سفید چمڑی والے عاشقوں کے نرغے۔ جوان لڑکیوں کی کمی جس نے

کواریوں کو بھی پاپڑ بنا دیا تھا۔ اور وہ ایک خستہ پاپڑ کی طرح ایک جبڑے سے دوسرے جبڑے میں منتقل ہوتی گئی۔ انگریز سارجنٹ کے ہاتھ سے جب زیادہ الاؤنس پانے والے امریکن سارجنٹ نے اسے جیت لیا تو وہ گھنٹوں آئینے میں اپنی چوڑی ناک میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر ایک دم جیسے اُسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ جنگ ختم ہوگئی۔ گورے سولجر ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور وہ ایک لٹو کی طرح ان کے گروہ میں بھنا کے ایک سے دوسری بانہہ میں منتقل ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کے بازو خالی فضا میں پھڑپھڑاتے رہ گئے۔ اس کے ساتھ والیوں نے جنگ کے زمانہ میں کتنا کچھ جمع کر لیا۔ یہ سفید سپاہی بڑے دل پھینک اور ساتھ ساتھ دولت پھینک بھی ہوتے ہیں۔ جاتے وقت وہ اپنی محبوباؤں کو کیا کچھ نہ دے گئے جس میں سے کچھ کباڑ خانوں کی نذر ہوا کچھ ہسپتالوں اور یتیم خانوں میں پہونچ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو مس راج اور اس کے گروپ والی لڑکیوں کی جنگ شروع ہوئی اور انھیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی بدصورت اور بے مصرف ہیں۔ دورانِ جنگ میں انھوں نے جو کچھ "ہنر" سیکھے وہ امن کے زمانے میں کام نہیں دے سکتے۔

زندگی کے اس اُدھا دُھند جکّڑ نے آج اسے تکلی بکڑا دی ہے ماموں جان ایک عمایر، ماہر نفسیات ہیں پھر بھی کئی بار جھنجلا کر مس راج کی تحلیل نفسی کر چکے ہیں۔ وہ مختلف مغربی ماہرین نفسیات کے اقوال زریں کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مِس راج کے تحت الشعور میں کوئی چبھن ہے جو تار کو بار بار گتھی لگا دیتی ہے۔

ممانی بھی خوب جانتی ہیں کہ یہ تحت الشعور کی چبھن کیا بلا ہے۔ مگر ان کی تحلیل نفسی نہایت بھوڑپنے کی بدظنی ہے۔ جس کا اظہار کرنے کی طاقت وہ عرصہ ہوا کھو چکی ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ کھلے بندوں زنڈی کے کوٹھے پر چڑھتے تھے، آج ان کے سپوت شعور اور لاشعور کی چلمن ڈال کر وہی کچھ کر لیتے ہیں۔ مگر وہ اتنا جانتی ہیں کہ مس راج بھی ان سے کم مجبور نہیں۔ جینے کا خیال چھوڑ کر ساری عمر مس راج اسی طرح ادھیڑ عمر کے ماہرین نفسیات کی ذہنی ٹھوکروں میں رُلتی رہے گی۔ ان کے لاشعور ہاتھوں کا کھلونا بنی رہے گی۔ ہر قہقے پر تار ٹوٹتا ہے تو جھلا کر چونک پڑتی ہیں۔ ان کا افغانی نسل خون کھول اُٹھتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تکلی بھینچنے لگتی ہیں۔ جیسے کسی کا گلا گھونٹ رہی ہیں، مگر دوسرے لمحے اہنسا کے سایے میں پلی ہوئی شیرنی دبک کر سوت جوڑ لیتی ہے اور ایک موہوم سہارے پر آگے چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی ساری بدنفسی کو اولاد نہ ہونے پر محمول کرتی ہیں۔ اگر آج ان کی گود میں ان چھ لڑکیوں کے بجائے ایک گھی کا لڈو ہمکتا ہوتا تو میاں کی مجال نہ تھی کہ ان کے سینے پر یوں دماغی سوتیں چڑھاتے۔ مگر لڑکے کا بیج سدا بیکار گیا۔ خواہ ایک ماہ کا بھی ہوتا وہ اسے بیٹوں ہی کی صف میں کھڑا کر کے ماتم کرتیں۔ وہ ایک مرد کے ہاتھ کے میل پر پلی تھیں۔ اب بھی ایک شریف مرد ہی ان کا کفیل ہے۔ پھر جب یہ مرد مروڑا دے دیتا ہے تو انھیں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اگر وہ خود ایک سہارا بن سکتیں تو پھر بڑھاپا تیر ہو جاتا مگر ماموں جان کہتے ہیں یہ بھی ان کا خاندانی قصور ہے۔ عموماً نوابوں، جاگیرداروں کے یہاں

اولاد نرینہ ناپید ہوتی ہے اور اس کا بھگتان وہ بھی بھگت رہے ہیں، ورنہ خود ان کے جسم میں تو نرینانے کا کافی مادہ ہے۔

کون جانے جس تکلی نے سوراج دیا کیا وہ انھیں ایک بیٹا نہیں دے سکتی۔ ایک دم ان کے چہرے کے کھنڈر جاگ اٹھتے ہیں۔ ڈراونی مسکراہٹ ایک نئی کروٹ بدل کر انگڑائی لیتی ہے۔ تکلی ناچ رہی ہے اور وہ مسکرا رہی ہیں اس کچے دھاگے کو وہ اکلوتے بیٹے کی طرح پروان چڑھتے دیکھ رہی ہیں.....

ایک سوت...... پھر دوسرا...... تیسرا اور چوتھا۔ سارے مل کر ایک مضبوط رسی بن جائے گی۔ بس راج کے گلے کو گھونٹتی چلی جائے گی۔ جس نے ان کا جیون امرت چرا لیا ہے۔

یوں آج باپو کی جینتی کے روز آتمائیں شدھ ہو رہی ہیں۔ گندی اور گھناؤنی آتمائیں۔

مگر لال باغ اور پریل کے علاقوں میں ایک بھی تکلی ناچتی نظر نہیں آتی۔ کسی کو آتما کو پاک کرنے کی فکر نہیں۔ اس چھین جھپٹ اس منافع خوری اور اشتہار بازی کے چوراہے پر دور کامگار میدان میں ممبئی کے محنت کش امن کانفرنس کے پہلے اجلاس کے موقع پر زندگی کے نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ یہاں باشعور محنت کش طبقہ کی رہنمائی میں چھٹنی کی دھار سے زخمی مزدور، فیسوں کے بار سے کچلے ہوئے طالب علم اور کم تنخواہ اور مہنگائی کے مارے کلرک اور معلم تیسری جنگ کے خلاف امن کا عزم لے کر جمع ہوئے ہیں۔ پچیس ہزار جانیں ایک

قالب ہو کر امید بھری نظروں سے آزاد ملکوں کے رہنماؤں کی تصویروں کو تاک رہی ہیں ۔ اپنے دلوں کی آواز اپنے ساتھیوں کے منہ سے سن رہی ہیں ۔

" تیسری جنگ نہ ہوگی ...... انسان انسان سے نہیں، اس بار حیوان سے لڑے گا ...... کالے بازار سے جنگ کرے گا ۔ ڈالر کے غلاموں کا مقابلہ کرے گا ۔ "

کون کہتا ہے یہ نہتے ہیں ۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خوفناک ہتھیار ہیں جن کے تخیل ہی سے سلطنتیں لرز رہی ہیں ۔ ایٹم بم کانپ رہے ہیں اور ڈالر کے پل ٹوٹ رہے ہیں ۔ یہ نظر نہ آنے والے پچیس ہزار فولادی تاروں کی ایسی رسی بٹ رہے ہیں جو ساری فاشسٹ قوتوں کا گلا گھونٹ ڈالے گی ۔

جبھی تو کامگار میدان کے چاروں طرف پولیس کا مسلح پہرہ ہے ۔ سی آئی ۔ ڈی کا چکر ہے ۔ رنگ برنگ ڈنڈے منڈلا رہے ہیں ۔ ......

ناجائز شراب پر پہرہ نہیں ...... کالے بازار پر پہرہ نہیں ...... چور اچکوں پر پہرہ نہیں ...... رشوت ستانی اور عصمت فروشی پر پہرہ نہیں ...... دنیا بھر کی غلاظتیں پھل پھول رہی ہیں ...... مگر امن چاہنے والوں پر پہرہ ہے ...... موت بے لگام طرارے بھر رہی ہے اور زندگی کے لبوں پر تالہ ہے ۔ سڑتے ہوئے گناہ کے سر پر قانون کی چھاؤں ہے ۔ شاداب انسانیت کے سر پر شیطانی آگ ......

آج میں اس مجمع کے درمیان میں کہاں کھو گئی ہوں ۔ پچیس ہزار

دلوں کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو چکی ہے کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ یہ پچاس ہزار آنکھوں میں میری آنکھیں کون سی ہیں؟ میری انفرادیت کہاں ہے؟ میرا شعور، لاشعور، میری جبلت، میری اُلجھنیں پریشانیاں اور میرے ذاتی دکھ درد کہاں ہیں؟

مگر اپنی وسعت پر خود حیران ہوں۔ ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میری انفرادیت کامگار میدان میں کھچا کھچ بھری ہے۔ یہ پچیس ہزار دل اور پچاس ہزار آنکھیں میری ہی ہیں۔ ذرا اور اوپر آنکھ اٹھاؤں تو پچیس لاکھ، پچیس کروڑ...... نہیں مجھے گنتی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ...... اس طوفان میں میں بھی ایک قطرہ ہوں ...... اور ہر قطرہ طوفان ہے۔

یہ بچے

ایک زمانہ تھا جب میرا خیال تھا کہ دنیا میں بچے کے سب سے بڑے دشمن اس کے ماں باپ اور بھائی بند ہوتے ہیں۔ وہ اس کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بیجا زبردستیوں سے اس کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو کچل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو بجائے مکمل انسان بننے کے چور، ڈاکو اور اچکے بن جاتے ہیں۔ جبھی تو ہمارا دیش ترقی نہیں کر پاتا۔

لیکن خود ماں بننے کے بعد میرے خیالات نے ایک دم سے پلٹا کھایا اور یقین ہو گیا کہ آج کل کے بچے ہی کچھ ضرورت سے زیادہ ہٹیلے، بے چین اور منہ زور پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی تعمیر میں ہی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو انھیں جنگلی بنا دیتی ہے۔ اگر سلیقے سے بچے پیدا کیے جائیں تو ہمارے دیش کے دلدر دور ہو جائیں گے۔

اسی سلسلے میں میں نے سائیکالوجی سے مدد لینی چاہی اور جی بھر کر تحلیل نفسی کر ڈالی مگر بیکار کیونکہ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ جس پگڈنڈی پر میں بھٹک کر چلی آئی

ہوں "یہ کچھ بھی نہیں" کی دنیا کے بیچوں بیچ ختم ہو جاتی ہے، میرے دونوں خیال غلط تھے، نہ ماؤں کا قصور ہے نہ بیچارے بچوں کا۔ قصور سارا ہے اس طریقہ زندگی کا جو ایک مخصوص نظام نے ہماری جانوں پر لا گو کر رکھا ہے جس نے ماں اور بچے کا رشتہ بھی توڑ مروڑ کر ایک کاروباری شے بنا دیا ہے۔ اول تو بچے کے خیال ہی سے ایک ماں لرز اٹھتی ہے۔ جسمانی کوفت کے ڈر سے نہیں، اس ڈر سے کہ گھر میں ایک اور کھانے والا منہ بڑھا۔ ایک اور جسم ڈھلنکنے کی فکر بڑھی۔ پھر اگر لڑکا ہے تو خیر خدانہ کرے لڑکی ہے تو ایک اور تاوان بھگتنے کو تیار ہو جائیے۔ اس کی شادی بیاہ کی فکر۔

لوگ کہتے ہیں کہ ادیبوں کو ادب سے سروکار رکھنا چاہیئے اور خواہ مخواہ سرکار سے نہ الجھنا چاہیئے تو بھئی یہاں کسے سرکار سے دست و گریباں ہونے کا شوق ہے۔ اب اس میں ہمارا کیا قصور کہ زندگی کے ہر موڑ پر سرکار سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ کتنا ہی دل کو سمجھائیں، اب یقین نہیں آتا کہ ہماری مصیبتوں کے بڑھانے میں دیوی دیوتا یا تقدیر کا ہاتھ ہے۔ ہم اب پہچان چکے ہیں کہ کس کا ہاتھ ہے جس نے اپنے بھیانک شکنجہ میں ہماری زندگی کی ضروریات کو دبوچ رکھا ہے وہ منافع خوروں .... چور بازاریوں کا ہاتھ جو ہماری سرکار کی لگام میں تھامے ہے اور جس کے اشاروں پر ہمارے اوپر مسلسل حملے کرتا ہے اور ہم یہ سب کچھ اس لئے سمجھ گئے ہیں کہ ہمارے سامنے روس کی شاندار مثال ہے۔ جہاں کا نظام مزدوروں اور کسانوں کا ہے جو انھوں نے برسوں کی محنتوں اور قربانیوں کے بعد خود اپنے لئے تعمیر کیا ہے۔ روس میں بچہ جنجال نہیں۔ ملک کا ایک طاقتور بازو ہے

ملک کی دولت ہے، جہاں پیدائش سے پہلے ہی ماں کی تخلیقی عظمتوں کو مرحبا کہکر آنے والے مہمان کی آؤبھگت شروع ہوجاتی ہے۔ اس سے باربرداری کے کام نہیں لئے جاتے بلکہ اس کی صحت کو اور بڑھانے کے لئے ہلکے ہلکے دلچسپ کام لئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے باقاعدہ خاص خوراک کا راشن مقرر ہوجاتا ہے۔ جب زمانہ قریب ہوجاتا ہے تو اسے ایک اچھے زچہ خانے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ بڑے سکون اور آرام سے جنم دیتی ہے۔ غلام ملکوں میں زچائیں فوراً ہی محنت مزدوری پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اپنی رہی سہی طاقت کھو بیٹھتی ہیں۔

مگر روس میں جب تک زچہ کو ڈاکٹر اس قابل نہیں سمجھتے نرسنگ ہوم میں ہی رہتی ہیں۔ جب مکمل طور پر جاق وچوبند ہوجاتی ہیں تب وہ کام پر لوٹتی ہے یہاں وہ بچہ کو کمر پر لاد کر نہیں لاتی جیسے ہماری محنت کش عورتوں کو کرنا پڑتا ہے کہ دودھ پیتے بچے کو سڑک کے کنارے ریت ...... دھول میں ڈال کر خود کام پر جٹ جاتی ہیں۔ روس کے سنہرے دیش میں بچوں کے گھر ہیں جہاں محبت کرنے والی نرسیں اور مشاق ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دن بھر بچے وہاں بڑے آرام سے رہتے ہیں، شام کو مائیں انھیں اپنے گھر لے آتی ہیں۔ ہمارے یہاں دوسرے سے تیسرے بچے کے آنے کی خبر سے ہی ماں باپ کے ہوش اُڑ جاتے ہیں پہلے تو محلہ ٹولے ہی کی فن کار روائیاں اس کو الٹی میٹم دینے کی کوشش کرتی ہیں جس کی وجہ سے ملک میں ہزاروں عورتیں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، یا سدا کی روگی بن جاتی ہیں۔ مگر روس میں زرخیز ہونے کو جرم یا گناہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ جیسے اچھے پھل پھول پیدا کرنے پر کاشتکار کی شہرت ہوتی ہے۔ اسی طرح زیادہ بچوں

والی ماں کو تمغہ یا انعام ملتے ہیں۔ وہاں یہ سارے بچے ماں کی چھاتی پر مونگ دلنے کو پلے نہیں رہتے نہ محلے ٹولے کا ناطقہ بند کرنے کو اچکوں کے گروہ مضبوط کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے بھی گھر ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ یوں تو امریکہ اور انگلستان میں بھی ایسے بورڈنگ موجود ہیں جہاں بچوں کو رکھا جاتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں کے بچے چھوٹی سی عمر میں ہی نہایت گندی عادتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے مفکر بڑی فکر میں ہیں کہ یہ بچے اتنے گمراہ کیوں پیدا ہو رہے ہیں اور وہ بیٹھ بیٹھ کر نفسیاتی توجیہیں ڈھونڈھ رہے ہیں حالانکہ بات سیدھی سادی ہے۔ امریکہ کے بچے وہاں کے سامراجی نظام کی پیداوار ہیں۔ جو والدین تجارتی منڈیوں اور سیاسی اسٹیج پر کر رہے ہیں، بچے وہی اسکولوں اور کالجوں میں کر رہے ہیں، وہی لوٹ مار، وہی ہتہ زوری اور غنڈہ گردی — آج وہ غنڈوں کے سردار ہیں۔ کل انھیں فرموں اور ملوں کا مالک بن کر اسی کھیل کو حقیقت بنانا ہے، وہی رنگ و نسل کی تفریق، ایٹم بم کی دھمکیاں ان کھیلوں میں رچی نظر آتی ہیں۔ ان ملکوں کو تو فخر کرنا چاہیئے کہ ان کی آیندہ نسلیں اتنی اتنی ہونہار پیدا ہو رہی ہیں تو پھر یہ حیرت اور تاسف کیسا؟ اس فضا میں پلنے والے بچوں پر کوئی تعلیم کوئی تربیت اثر نہ ڈال سکے گی۔ سب سے بڑی تربیت عمل ہے اور روس کی گورنمنٹ کا عمل وہاں کے عوام میں جھلکتا ہے۔ ہر روسی بچہ اس عمل کا عکس لے کر زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ اسکے علاوہ بچوں کے لئے وہاں علیحدہ سینما گھر تھیٹر اور لائبریریاں ہیں۔ جہاں انھیں کھیل ہی کھیل میں محنت کش اور مفید انسان بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر اسکا آیندہ فرض زندگی مقرر کیا

جاتا ہے۔ وہاں انھیں بتایا جاتا ہے کہ ایک محنت کش ایک فنکار وہ خواہ کسی ملک اور کسی رنگ اور نسل کا ہو ساری دنیا کی دولت ہے۔ اور اس کی اپنی دولت ہے اور اپنے ملک کے لئے دولت خرید کر نہیں خود اپنے قوت دبازو سے پیدا کی جاتی ہے۔ بچوں کو ملوں میں بھاری کام نہیں دیے جاتے تاکہ ان کی بڑھوار نہ ماری جلئے۔

وہ مائیں جن کے بچے دن رات ان گھروں میں رہتے ہیں، اپنے کام سے لوٹ کر وہاں جاتی ہیں اور وہاں اپنے ہی نہیں ہزاروں اور بچوں کو کلیجے سے لگا کر مامتا ٹھنڈی کر سکتی ہیں۔ روس کے دشمن کہتے ہیں کہ اجتماعی زندگی نے گھریلو زندگی کو فنا کر دیا ہے" ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ روس میں ایک بانجھ کو بھی بچے گود لینے کی ضرورت نہیں، ملک کے سارے بچے ہی اس کے بچے ہیں، سارا ملک ہی ایک خاندان ہے جہاں نہ بچوں کی کمی ہو سکتی ہے نہ ماں باپ کی۔

مگر ہمارے ملک میں ہماری سرکار کی رائے ہے کہ شکر کے دانے گن گن کر مائیں بچوں کو جنم دیں، نہ ضرورت سے زیادہ بچے پیدا ہونگے نہ شکر کی کمی پڑے گی۔ کیونکہ اب یہ ڈر ہو گیا ہے کہ کمیونسٹ ماں کے پیٹ ہی میں بچے کے کان میں سرکار کے خلاف بھڑکانے والی باتیں پھونک دیتے ہیں۔ جبھی تو آج کل کے بچے جنم سے شکر دودھ کے لئے منہ پھاڑے پیدا ہوتے ہیں۔

اسی لئے ہماری مہربان سرکار نے "اناج اگاؤ" کی اسکیم سے زیادہ زور شور سے "بچہ نہ اگاؤ" کی اسکیم جالو کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ایسے ملک میں اگر کوئی ڈھیٹ بچہ آن ہی ٹپکتا ہے تو وہ ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں

بچے آنکھ کا نور دل کا سرور ہوتے ہیں۔ ہوتے ہونگے، گر ہماری آنکھیں تو آنکھوں کے اس نور کو ناکافی اور غلط خوراک کی وجہ سے بجھتے دیے کی طرح کا نپتا دیکھتی ہیں جس بچے کو دیکھئے دنیا بھر کے روگ جان کو چمٹے نظر آتے ہیں۔ خون کی کمی کی شکایت تو عام ہوتی ہے جسکی وجہ سے آئے دن بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اسپتالوں میں ننھے ننھے مرجھائے ہوئے پھول ہزاروں کی تعداد میں کیوں کھڑے رہتے ہیں؟ سڑکوں پر لاکھوں معصوم ہاتھ ہماری طرف بھیک کے لئے پھیلے نظر آتے ہیں، اور ہمارا ضمیر اس طمانچہ سے تلملا کر رہ جاتا ہے۔ جس عمر میں روس کے بچے کھیل کود کر صحت بناتے ہیں۔ ہمارے بچے روزی کی فکر میں پریشان فٹ پاتھ پر پاٹیہ لیئے بیٹھنے میں گزار دیتے ہیں، روس میں چودہ پندرہ برس کی لڑکیاں یونیورسٹی کی ڈگری کی تیاری کرتی ہیں۔ ہمارے ملک کی اس عمر کی زیادہ تر لڑکیاں فلمی گیت گنگنا کر ساجن کو پکارنے میں گزار دیتی ہیں۔

روس میں ہر بچے کو مفت تعلیم دیجاتی ہے بلکہ جبریہ تعلیم دیجاتی ہے اور ہمارے ملک کے طالب علم الٹی جبریہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان پر لاٹھی چارج ہوتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں اور انھیں سزائیں دیجاتی ہیں اسکول میں داخل ہی نہیں کیا جاتا۔ اب تو نام نہاد تعلیم کے دروازے بھی بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ علم کو حماقت سمجھ کر فیس بڑھاتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے جہاں پیٹ کی آگ بجھانے ہی سے فرصت نہیں ملتی وہاں تعلیم کے لئے خرچہ کہاں سے آئے؟ دوسرے ہمارے نیتاؤں کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں گر ہم جانتے ہیں کہ ہمارے نیتا تعلیم سے کیوں ڈرتے ہیں کیونکہ

وہ جانتے ہیں کہ باشعور انسان کا خون آسانی سے نہیں چوسا جا سکتا۔ پڑھ لکھ کر وہ اگر امریکی بلاک کی تعلیم کے دائرے تک محدود رہے تب تو خیریت ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ روس کی تعلیم پر بھی نظر ڈالنے لگتے ہیں جو اسے مشین میں پسنے، ہلوں میں جوتے جانے اور کارخانوں میں ناکافی معاوضے پر جُٹے رہنے کے خلاف بغاوت پر ابھارتی ہے۔ ہندوستان کی مائیں جب روسی بچوں کی طرف دیکھتی ہیں تو وہ اپنے لعلوں کے لئے بھی وہی سہولتیں مانگنے لگتی ہیں جو انھیں میسّر نہیں۔

جبھی تو حکومت کے دشمنوں کے کیمپ میں جا شامل ہوتی ہیں۔ مگر ہماری ممتا محدود نہیں۔ ہمیں روس کے بچوں سے پیار ہے، وہاں کی خوش نصیب ماؤں سے پیار ہے، وہ خواہ کسی ملک رنگ اور نسل کے بچے ہوں۔ دنیا کے بچے دنیا کی ماؤں کے بچے ہیں۔ وہ ہمارے بچے ہیں۔ ان پر یہ منڈلاتے ہوئے گدھ چھاپہ نہ مار پائیں گے۔ ہم دنیا کے بچوں کے لئے، انسانیت کے مستقبل کے لئے ہر گروہ طاقت سے مقابلہ کریں گے۔ ہم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کھویا اپنے بچوں کی زندگی میں پانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان کے لئے ان کا مستقبل پرامن اور روشن بنانے کیلئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیں گے۔

مبارک ہے وہ ملک جہاں بچہ سچے معنوں میں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جو انسانیت کا محافظ ہے۔ جہاں عورت۔ ماں بن کر پچھتاتی نہیں بلکہ نسوانیت کو چار چاند لگاتی ہے اور فخر کے ساتھ اپنی کوکھ کی دولت کو پھلتا پھولتا دیکھتی ہے۔

آج روس کی بتیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم عہد کرتے ہیں کہ روس کے عزائم کو مشعل راہ بناکر ہم اپنے بچوں کا مستقبل بھی اتنا ہی روشن اتنا ہی شاندار بنائیں گے جیسا روسی بچوں کا ہے۔ ہماری یہ جنگ ہمارے بچوں کی خاطر ہے ان کی حفاظت کے لئے ہم تمام فاشسٹ طاقتوں سے لڑیں گے۔

لال چیونٹے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بور جھڑ کر پیڑوں پر سبز قمقمے ٹمٹمانے لگتے ہیں، دوپہریں سنسان اور اونگھتی ہوئی ہو جاتی ہیں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اُجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑی ہی اور خاک آلود ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے۔ میں پچھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور روکھی نہ رہے۔ میری بادیہ پیمائی بے کار نہ گئی اور آن کی آن

میں دوپٹہ اُتار، میں جھاڑ جھنکاڑ ٹہنیوں میں ہرے ہرے مقتے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو……

اس سے قبل کہ میرے بھو کے دانت سبز چادر کو چاک کر کے مدہوش کن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ نسبمل کی طرح زمین پر تڑپتے ہوئے پایا۔

لال چیونٹے!

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چٹے پڑ گئے تھے۔ ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سر یاقوت کی بوند کی طرح سیفٹی پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس ہائے توبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے مگر توبہ کیجیے کھوپڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوتا تھا چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بے کار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم پٹی، پیپ خون پچپچاتے ہوئے مرہموں سے دست و گریباں رہنا پڑا۔ کچے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں، زندگی کے اگن نے جی بھر کر بھرتا بنا دیا ہے وہ دہکتی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفریتیت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی یاد کا واسطہ دیکر

ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنسان ہو جائیں للّٰہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھیئے گا جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں .... اوہ! آپ بھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں، ماشاء اللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں جو جلتی دوپہروں میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے الجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤں پیچ میں اپنا ہی پیر کچل جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر دھرنا چاہیئے کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہوں اور کیا؟ کون جانے؟ کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی جبھی تو ایک اداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بے کاری نے اکسایا اور میں بیتے ہوئے واقعہ کی یاد بھول کر دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان۔ سی۔ سی۔ آئی اور ریس کورس میں تہذیب اور انسانیت کا بے نظیر وظیفہ دہرا رہے تھے میں بھٹکی ہوئی پھل پائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آجائے تو یہ شام اتنی نیم مردہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غصّے کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما ہال کے آگے ڈراؤنے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی گھٹن گیا۔ وہ اشوک کمار کی جھنجھنی جیسی ٹھوڑی، مہتاب کے ابلتے ہوئے ہونٹ، سورن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ۔ دنیا کا پہلوانی بازو۔ توبہ۔ میری ایسی کون خطا ہوگئی جب کے

جرم میں یوں عذاب دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔

"ٹیکسی موڑو" میں نے جھلا کر ڈرائیور کو ڈانٹا۔ کونے پر موٹر لوٹتے بچ کر رُک گئی۔ سامنے ایک عجیب الخلقت اشتہار لگا تھا۔

"امرہندستان ...... اکسلسیر .... عوامی تھیٹر"

ان تین چیزوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ بھلا امرہندستان کون شے ہے؟ ضرور کوئی بھوتوں کا قصہ ہوگا۔ جی مجھے بھوتوں کے قصے بہت پسند ہیں پتہ نہیں کیوں! ضرور کسی ممی کے افسانۂ عشق کا جھگڑا ہوگا ورنہ حضرت ہندستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہوگیا اور اب تو سڑگل کر دوسرے ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندستان تو بیشک بنجر ملک ہے مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ میں زیادہ حیل وحجت کی قائل نہیں۔ حکمائے اعظم کے اس بیان پر کہ ہندوستان مرچکا میں نے کبھی کا فاتحہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مر ہی گیا تو پھر واویلا سے کیا فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل۔ مرحوم کی روح کو اور عذاب ہوگا۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس سڑاندی لاش کو جھٹ پٹ دفن کر کے دھوم دھام کا نتیجہ کیا جائے اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف منہ اٹھا کر دل کو ڈھارس دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھئے نا۔ کمبخت ملک کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ گو ویسے خود میں نے تو نہیں مگر ہاں میرے پیارے ملک کے احمق جاں نثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا اور بھئی کیا میں بذات خود بھگتتی تبھی کچھ ہوتا۔ ایسے کیا مجھ میں سرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی

سے پھاٹک سے ملک آزاد ہو جاتا۔ ارے بھئی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد ہونا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب لپیٹ میں آجاتے اور کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی کچھ اُمید ہو تو کوئی کچھ کرے بھی۔ ہاں نہیں تو ویسے اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے بچے تو غمِ جیل یعنی سرکاری نوکریاں ایک سرے سے نصیب سے غائب۔ بھئی نہ تو میں ایسی حماقتوں کی طرفدار اور نہ ہی قائل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا کیا ہرج ہے آج "امر ہندستان" کا ڈھکوسلہ ہی چلے۔ ارے ایسا بھی کیا ڈرنا۔ کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے اکسلیبرس! یعنی دیسی ٹھرّا اور ایک دم تاج میں! کیا کچھ نہ معجونِ مرکب ہوگی مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ میم صاحب دیکھنے میں تو خاصی ہیں پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

دروازے پر سے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سامنے دو چار بچے کھچے گنجے حُلیے کے ہیولی منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین پھوہڑ قسم کی لڑکیاں) پروگرام بیچ رہی تھیں۔ دمینتی کو تو میں صاف پہچان گئی۔ پرلے درجے کی پھوہڑ بنگلی۔ ماشاءاللہ پوری آستین کا کرتہ گرمی کے زمانے میں دانتوں سے نوچ کر نیم آستین بنالیا جاتا ہے۔ کنارے ترپنے کی توفیق نہیں اور چلی ہیں پروگرام بیچنے۔ ارے ایسا ہی تھا تو پوپٹ والا کی لڑکیوں کو بلا لیا ہوتا۔ خدا قسم ٹامیوں تک کا بیڑا اوکر ڈالیں! بارہ آنے کا پروگرام پورے ایک روپے کیں لے کر میں تو جلدی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کمبخت ایسی

بُری عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر مُنھ اُتر گیا۔ بس یہ سمجھئے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکا دُکا فلک کی ستائی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اے ہے یہ میں نے کیا حماقت کی اس سے تو بھگت بوڈا نما" ہی دیکھ آتی۔ خیر کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رک گئیں۔ سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری بادہ پیمائی بے کار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر والی کرسی پر تھا اور میں اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط۔ پردہ اٹھا تو دو چار ملگجے کپڑے پہنے اُجڑے حلیے کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ دوڈر، نہ جھم جھاتے کپڑے۔ بس مسلی ہوئی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے کرتے اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علیگڑھ کالج میں صبح گایا جاتا تھا۔ کیا سریلی اور میٹھی لے ہوتی تھی کہ گاتے ہی میں جمائیاں آنے لگتی تھیں اور روز یہی جی چاہتا تھا کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکیے دے کر ہال ہی میں پڑ رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں نغمہ تیز ہوتا گیا دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا کہ دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھولی ہی نہیں

گئیں بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جوتے مار مار کے منوایا جا رہا ہے کہ "ہندستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے کہ ایک دفعہ کو بہرا کان بھی چیخ اُٹھے۔ بھلا ان اللہ کے بندوں سے کس نے کہا ہوگا کہ اتنی گرمی کے زمانے میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھ دو کہ دماغ میں چڑ کے لگنے لگیں اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ غریب راج ویسے ہی جذباتی ہے۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا پروگرام کا ورق الٹا۔

اندھیری گھپ اسٹیج پر لال بھوت اپنی پوری خباثت سے جھپٹا نقارے کی چنگھاڑ سن کر سارے ساز چونک اُٹھے، غرّانے لگے۔ نفیری چیخ اٹھی اور ستار کے تار جھلّانے لگے۔ سازوں کی فوج یکا یک پکار کر انسانوں کو پکارنے لگی دم بھر میں جی دار چاروں طرف سے ننگی تلواریں چمکاتے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے اُمنڈ کر دشمن پر الٹ پڑے نپے تلے قدموں سے بڑھتے ہوئے ٹیکھی ٹیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ سب کے سب نشانہ باندھ کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے، مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے پردہ گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاحول ولا قوۃ تین آدمی تو تھے ہی اسٹیج پر اور وہ بھی ٹڈوں جیسے سوکھے مارے۔ یہ میرے واہمے نے انھیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیول بنا لیا اور تین ہی تو عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بھولے بھولے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دہک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھواں۔!

جی چاہا گھبرا کر بھاگوں! مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم

کے دو ٹکڑے کر گئی تھی "بھاگ یہاں سے" پیر کہتے تھے۔

"ذرا ٹھہر!" دل نے پکارا۔ ان اعضا کی تو تو میں میں سے ہلکان ہو کر میں اور بھی سہم گئی۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا اور بالکل ہی لرز گئی۔ پردہ گر چکا تھا، مگر معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پرت پردوں سے اٹھے چلے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک زہر میں بجھی ہوئی چمک تھی اور ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ اس کا سینہ بوجھل بادلوں کی طرح اُبل اُبل کر دب رہا تھا۔

"راج!" میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر جلد ہی اُس بھونچال سے سہم کر میں دور ہٹ گئی۔ "راج!" میں نے پھر پکارا "کیا طبیعت خراب ہے؟" "نہیں تو۔" اس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز دنیا سے واپس کھینچ کر کہا "گھر چلو گے؟"

"نہیں...." اس نے ڈانٹ بتائی۔ "توبہ ہے۔ لعنت ایسے تماشے پر کہ جی ہلکان ہو جائے۔" یہ اُلٹے ہاتھ پر شانتی تھا اور سامنے پریم...... میں ان سب کو جانتا ہوں۔" اس نے فخریہ کہا گویا ان سب کو جاننا مقصدِ زندگی ہو۔

"وہ سچن شنکر تھا، ادوے کا رشتہ کا بھائی!"

"ارے وہ لمبوترا سا؟"

"وہ لمبوترا سا قطعی نہیں تھا۔" اے لو۔ راج بُرا مان گیا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے۔" "ضرور ہو گا۔" میں نے جل کر کہا "مگر ادوے شنکر کا بھائی

خوب کماتا ہوگا ۔" "وہ کچھ بھی نہیں کماتا ۔" "گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے ۔" "چالیس روپے ملتے ہیں ۔"

"روز ؟" "......... تو اور کیا کسی کا سر ے گا ۔"

"جی ۔ روز نہیں، مہینہ بھر میں ۔"

"ارے ۔ اور اس سے شنکر اسے کچھ نہیں کہتا ۔"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا ۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی ۔ آہ یہ ہونہاریوں مٹی میں عاقبت رُلا رہے ہیں ۔ ارے صاحب یہی تو وقت ہے کمانے کا ۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں ۔ دیکھئے نا ۔ کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں ۔ اس سے تو کچھ مہاراج ہی زیادہ عقلمند ہے ۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے بس اسی کے ذریعے ہزاروں کما رہا ہے ۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا ۔ وہ آتش فشانی کیفیت غائب کر کے مجسّم شعر بنا بیٹھا تھا ۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سُر تال پر پھدک رہی تھیں معلوم ہوتا تھا وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں بلکہ یہ میٹھے میٹھے سُر اُن کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں ۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھلے جا رہی تھی ۔ ننھی ننھی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رنگینیٔ احساس کو ڈبو کے دے رہی تھیں ۔ اور آج ـــــ ؟

راج بے حس تھا مگر معلوم ہوتا تھا اس کا وجود ناچ رہا ہے ۔ اس کی

آنکھیں تھرک رہی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ عوامی جھمیلا مجھے پسند نہ آجائے۔

"کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں؟" ختم ہونے پر میں نے پوچھا

"نوکر نہیں، یہی مالک ہیں"

"خیر ہوں گی" میں نے جل کر کہا "مگر چالیس روپے ہیں تو...."

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا میں سوچتی رہی پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی تکونی، بھینگی ہیروئن بھری پڑی ہے اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا۔ جبھی تو ہندستان اتنا غریب ہے۔ جدن بائی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے تو اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی کہ اس عوامی تھیئٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے۔ کس قدر دسترس ہے اور وہ کمبخت طوطے کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مجھی کو اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دے رہا ہے اور اب جسم کے پرزے پرزے اڑے اور اب اڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ پست طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک

سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا؟"

"ہُنہ یہ بنوتے ہے"۔ راج نے ایک لمبا سا لکچر پھر شروع کر دیا اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگا لی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے۔

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی؟"

"یہ پریتی سرکار ہے"۔ راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا سٹ پریزنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وہ کون ہے؟" میں نے کیوپڈ جیسے گھنگھریالے سر اور مونالزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ روی واہے، اودے شنکر کا چھوٹا بھائی؟" اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار۔ دو گھڑی بعد جا بجن سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے چٹخارے آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار۔ توبہ۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال

چیونٹے۔ مجھے احمق نہ سمجھیے، میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں۔ پروگرام کا آخری حصہ شروع ہوا۔ اختتام پر وہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں کچے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی۔ اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل و دماغ پر حملہ بول دیا۔ بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا۔ ہوا میں چاروں طرف سے غیر مرئی جانتے گھومنے لگے۔ احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا۔ جوں ہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا۔ جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول کے غول بھاگے چلے آرہے ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو۔ کتنی بھی اُداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو۔ زندگی کتنی بھی سستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پُرامن بل سے نہیں نکلتی۔

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلقِ خدا کے بھلے کے لئے آگاہ کردوں۔ اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھئے گا۔ اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔ دیکھیے وہ جو میں نے زمانہ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں انھیں بھول جائیے۔ اب میری کایا پلٹ ہوگئی ہے اور لوگوں کی فلاح و بہبودی ہی میرا دین وایمان ہے لہذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکیے۔ ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجیے ورنہ وہی ہوگا جو روس میں ہوا اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اٹھا چکی ہیں

اٹھا رہی ہیں اور ابد تک اٹھاتی رہیں گی۔ اٹھیے اور ان مہذب قوموں کا ساتھ دیجیے ورنہ یہ برسوں کی گھسی گھسائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے۔ عرشِ تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے پھینکا جا رہا ہے۔ یہ لال چیونٹے دبے پیر سر جھکائے دھاری دار نیزوں جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں۔ آنکھ بچی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالیں گے۔ یہی ناچ رنگ جو آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں، ایک دن تگنی کا ناچ نہ نچا دے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجیے گا۔ اس تماشے کے خاتمے پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانیے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھیے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانک دیے جائیں اور اگر کوشش بھی کی گئی تو یہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ جو دو چار بچارے خوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں، بھی نہ رہیں گے۔ وہی گاڑھا گزی باہر والے ہنسیں گے۔ وہائٹ آوے کا کیا ہو گا؟ رسیا مل اور بھگو مل کہاں جائیں گے؟ اگر آپ یوں ہی سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ دیکھیے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گزر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گو یہ تو اطمینان ہے کہ ان کی پہنچ اسکولوں میں نہیں اور ہمارے بچے

مرنے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹ پٹا۔ خشک کاغذی چیتھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے۔ جو اتنا ردی چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کر دو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے۔ مگر یہ نئی چال۔ مگر یہ نئی چال جو عوامی تھئیٹر کی آڑ لیکر چل رہے ہیں کافی دیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھوڑ اپن دیکھئے ان کا۔ تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولے بنا کر نچانے لگتے ہیں۔ ذرا سوچیئے۔ رقص دیوتاؤں کی ودیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا کچومر بنانے کے لئے پست کیا جائے۔ امر ہندستان میں صاف ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے تھے اور چٹکیوں میں ہندستان کا سودا کر بیٹھے۔ حالانکہ میں نے آٹھویں جماعت میں صاف صاف پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً قسمیں دے دے کر ہندستان ان کے سر مڑھ دیا گیا۔ سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ کتنی شریف اور راست باز قوم ہے۔ ہندستان کی خاطر یہ لوگ کیا کیا دکھ نہیں اٹھاتے۔ حضور گورنر جنرل اپنا اچھا خاصا ملک اجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ہے اور پھر پارٹیاں کھانے اور گوٹے کے ہار پہننے کے لئے کتنی کتنی دور جانا پڑتا ہے۔ بیچاری ملکہ وکٹوریہ تو خود دلی تک آگئیں۔ چیلوں کے بیٹھنے کے لئے اپنا مجسمہ تک لگوا دیا۔ اور اس سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ضدی ملک کے لئے

جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں۔ اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مر گئے مگر کاہلوں سے اتنا نہ ہو سکا کہ کما کھاتے۔ اور تو اور سُنا ہے ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے؟ کبھی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہوگے تو آپ کو بھوک لگے گی۔ کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کنوئیں کے پاس۔ اور وقت کی پابندی تو ہم ہندستانیوں کو کبھی آئی اور نہ آئے گی۔ وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے اور بھوک مر جانے سے آدمی آپ ہی مرے گا۔

اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جائیے گا۔ خواہ مخواہ ان لوگوں کی بدمذاقی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی۔ یہ حاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور ان کے کلیجے میں آگ لگی اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں ہی کو بدنام کرتی ہے۔ لوگ ان ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا اس ہزار کے نوٹوں والی بدمذاقی میں سوائے کنگال اور بھک منگوں کے اور کون پھنسا ہوگا۔ بیچاروں کو ہزار ہزار کے نوٹ چار چار تین تین سو میں بیچنا پڑے۔ ذرا حساب لگائیے تو معلوم ہوگا کہ ایک کنگلے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندستان میں گداگری کی لعنت ہے۔

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں۔ بزنس کی ہو تو کالے گورے کا پتہ چلے۔ یہ بزنس مذاق نہیں کہ اُٹھے اور ناچنے لگے۔ اکنومکس

کے بارے میں الف کے نام لٹھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقید یں کرنے ! یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم ---- مانگ زیادہ مانگ کم۔ رسد کے پو بارے۔ ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کما سکتا ہے کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کما سکتا۔ صاحب! یہ تو بزنس کے گر ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی"۔ ابھی یہی چاول بھوسے کے بھاو پھنکتا۔

اگر آپ یونہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندستان میں بھی وہی ہوگا جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے۔ خواہ آپ کو کتنی بھی سستی ستا رہی ہو، کام ضرور کرنا پڑے گا۔ آپ کے پیارے بچے یتیم خانوں میں چلے جائیں گے۔ اور بیوی سرکاری طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہوگا۔ چاہے پوچھ لیجئے بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال چیونٹے تہذیب و تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ اُف۔ پتہ نہیں بھئی یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپگینڈا کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ ہی کہتے ہیں کچھ ہوگا۔ جبھی تو دنیا کہتی ہے۔ بڑے بڑے لیڈر کہتے ہیں تو کیا خدا نخواستہ مذاق کرتے ہیں۔

یہ میل کے قائل ہیں۔ صاف بات اس گھمس کی گرمی میں تو میں کبھی

سے ملنا حماقت سمجھتی ہوں۔ کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ! ذرا سوچیے اگر ایک موٹے سے مٹکے میں ایک سو کھا مارا مسلمان گھول دیا جائے تو کتنا بڑا ڈھیر ہو جائے گا۔ اُبل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چھپاتے پسینے میں عرق ——— جی چاہتا ہے بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر ڈالیں نہیں بھئی! میں کچھ سچ سے بہت ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندو مسلمان کا جوڑ ہی کیا۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اللہ توبہ۔ بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں! اس ٹھنڈے انجن میں بس بھاپ کی کسر ہے۔ اگر غلطی سے پوری ہو گئی تو بس لوگ منھ پھاڑے دیکھتے رہ جائیں گے اور یہ ہیبت ناک انجن اس جگمگاتی دنیا کو روندتا سرمست ہاتھی کی طرح دندناتا اللہ جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہٰذا ابھی وقت ہے جاگیے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے کا مقابلہ کر ڈالیے۔ ان کے بل معلوم کیجیے اور تیز سے تیز فلٹ کا نسخہ ایجاد کر کے استعمال کیجیے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے۔ ان جراثیم کی تلاش میں آپ کو اچھے بھلے تندرست جسم چیرنا پڑیں گے۔ ہزاروں ناموں اور کاموں کی آڑ میں چھپے یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں تو کہیں ادب کی ٹٹی کی آڑ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے رت اور سنگیت کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں تو کہیں پردۂ سیمیں کے نیچے سماج کے حق میں دیمک بن کر رینگ رہے ہیں۔

انھیں ڈھونڈھ نکالیے۔ ہوشیاری سے نتھنے پھلا کر سونگھیے۔ ان کی بو

ملک کے کونے کونے سے خود دوڑی آئے گی اور بس ناک کی سیدھ میں دوڑ کر انہیں پکڑ لیجئے اور پھر.......... انجمنیں قائم کیجئے، جلسے کیجئے، لکچر دیجئے، رزولیوشن پاس کرائیے۔ ان کے خلاف پروپگنڈے کا ایسا جال بچھائیے کہ قدم قدم پر منہ کے بل گریں، ان کے اخبار جلا دیجئے۔ پریس بند کردیجئے۔ ان کی پیشانیوں پر سرخ لوہے سے بالشویک داغ دیجئے۔ یہ لوگ بالشویک ہیں گویا جانتے نہیں۔ ان کی تحریروں پر دفعات لگائیے۔ مقدموں کے ذریعے بپتھیاں دے کر پست کر ڈالئے۔ تاج شاہی کی مدد لے کر کچہریوں میں گھسیٹئے اور یہ جہاں ملیں، جب ملیں، ان کو تباہ کر دیجئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام بااثر رؤسا، علمار دین اور سرکاری افسروں کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجئے۔ ہال کے باہر پکیٹنگ کیجئے اور اندر دنگا مچائیے۔ اسٹیج پر اتنا اودھم مچائیے کہ طبل جنگ کی پکار دہیں یتیم مردہ ہو کر سسکنے لگے، ورنہ یاد رکھئے اگر یہ خونی گرج ایک بار نئی پود کے کچے کانوں میں گونج گئی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے، اور آج جو تلاطم میں نے راج کے سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا، وہ ننگی تلواریں جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آنکھوں میں جگمگا اٹھیں گی۔

میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ بات ہنسی میں ٹالنے کی نہیں، ایسا نہ ہو کہ اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لٹکا دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے کہ آپ کو دستِ تاسف ملنا پڑے، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھلیان

کر چکی ہوں گی اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہو گا پھر اس وقت آپ کتنا ہی پچتائیں، نادم ہوں، مجھے یاد کریں، میرا مجسمہ بنوا کر شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں، کچھ بھی نہ ہو گا۔ کیونکہ دیکھیئے اگر یہ لال جیب نے موجودہ نظام کے جسم کو ایک دفعہ لپٹ گئے تو اس جنم میں تو نہ چھوڑیں گے اور پھر یہ بھیانک زخم کسی مرہم سے پُر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیئٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھلانے پر تُل ہی جائے تو خبر دار ٹکٹ ہرگز نہ خریدئیے گا اور نہ کسی کو خرید نے دیجیئے گا۔ ہاں اگر مفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر پرتیتی سرکار، روپہلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی، تھرکتی، اٹھلاتی آواز۔ بنوے کی اتھاہ سمندر جیسی گہری گونجتی، گرجتی، اُبھرتی ڈوبتی تانیں اور رتیا کی برساتی جھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی، میٹھی میٹھی مرکیاں تھوڑی دیر کے لئے انسان کو......... لاحول ولا قوۃ۔ میں پروگرام پسند کرتے کرتے بچی۔

چھوئی موئی

آرام کرسی ریل کے ڈبے سے لگا دی گئی اور بھابی جان نے قدم اٹھایا "الٰہی خیر! ...... یا غلام دستگیر ...... بارہ اماموں کا صدقہ۔ بسم اللہ بسم اللہ ...... بیٹی جان سنبھل کے ...... قدم تھام کے ...... پائنچہ اٹھا کے ...... سہج سہج" بی مغلانی نقیب کی طرح للکاریں۔ کچھ ہمیں نے گھسیٹا کچھ بھائی صاحب نے ٹھیلا۔ تعویذوں اور امام ضامنوں کا اشتہار بنی بھابی جان تنے ہوئے غبارے کی طرح ہانپتی سیٹ پر لڑھک بیٹھیں۔

"پاک پروردگار تیرا شکر" بی مغلانی کے منہ سے اور ہمارے دلوں سے نکلا بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہانپ جانے کی عادت شاید وہ ساتھ لے کر تو پیدا نہ ہوئی ہونگی اور نہ نادل، دایاؤں کی لاڈ بھری گودوں میں انکا اچار پڑا۔ پھر بھی اوسط درجے کی خوبصورت دبلی پتلی لڑکی چند ہی سال میں پھپھولے کی طرح نازک بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ سیدھی ماں کے کوٹھے سے توڑ کر بھائی جان کے پلنگ کی زینت بنا دی گئیں اور وہاں ایک شگفتہ پھول کی طرح پڑے مہکنے کے سوا ان پر زندگی کا اور کوئی بار نہ پڑا۔ بی مغلانی

شادی کے دن سے انھیں پالنے پوسنے پر مقرر کر دی گئیں۔ صبح سویرے یعنی جب بڑے لوگوں کی صبح ہوتی ہے۔ سلپچی میں منہ دُھلا کر وہیں مسہری پر جوڑا بدل کر چوٹی کنگھی سولہ سنگار کر کے بھرپور دلّی کے ناشتے کا خوان سامنے چن دیا جاتا جیسے صاف کر کے میری بھولے بھولے کلّوں والی بھابی ہتھیلی پر ٹھڈّی رکھے بیٹھی مسکرایا کرتیں۔

لیکن یہ مسکراہٹیں شادی کے دوسرے ہی سال پھیکی پڑ گئیں اور ان کا سلسلہ ہر وقت تھوکنے اور قے کرنے میں گزرنے لگا۔ مہکتے ہوئے پھولوں میں لدی مہ پارہ کے بجائے اس روگ میں مبتلا بیوی کو پاکر بھائی جان بھی بدکنے لگے مگر اماں بیگم اور بی مغلانی کے یہاں تو جانو بہار آگئی۔ پہلے ہی مہینے سے گدیلے پوتڑے اس زور و شور سے سلنے لگے جانو کل ہی برسوں میں زچگی ہونے والی ہو مارے تعویذوں کے جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، آئے دن کے ٹونے ٹوٹکے دم بولانے لگے۔ ویسے ہی بھابی جان کے دشمن کاہے کو چلنے پھرنے کے شوقین تھے اب تو بس کروٹ بھی لیں تو مغلانی بی اللہ بسم اللہ کرکے جزجز کاروں سے گھر سر پر اٹھا لیتیں اور بس دن بھر وہ کچے گھڑے کی طرح سینت کر رکھی جاتیں۔ صبح شام پیر فقیر دم درود کرنے اور پھونکیں مارنے آتے۔

لیکن باوجودیکہ مغلانی کا پہرہ سخت تھا، کچّا گھڑا وقت سے پہلے ہی کھل گیا اور ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ ڈال پھر خالی رہ گئی۔ بور جھڑ گیا۔ پر جان بچی لاکھوں پائے، اللہ اور دے گا۔ گھر کی دولت ہے۔ اللہ نے اور دیا۔ پہرہ پہلے سے چوگنا ہو گیا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ ذرا قابلِ غور بن گیا۔ مارے دواؤں کے

بھابی جان کا پلپیھن نکل گیا۔ رنگ ایک سرے سے غائب۔ صرف پھولی پھولی اُبلی ہوئی شکر قند جیسی رہ گئیں۔ بھائی جان کی شام رات کے بارہ بجے ہونے لگی بی مغلانی اور اماں بیگم کے تیور بھی ذرا چڑھنے اُترنے لگے اور بھابی جان کو مسہری پر پڑے پڑے بھائی جان کی دوسری شادی کے شادیانے سنائی دینے لگے۔

اور جب اللہ اللہ کر کے پھر وہ دن آیا تو پیروں، مریدوں کے علاوہ دہلی کے ڈاکٹر بھی اپنے سارے تیر تفنگ لے کر تعینات ہو گئے۔ خدا کے کرم سے اٹھوا مہینہ لگا اور بھابی جان صابن کے بلبلے کی طرح روئی کے پھولوں پر رکھی جانے لگیں۔ کسی کو قریب کھڑے ہو کر چھینکنے یا ناک سنکنے کی بھی اجازت نہ تھی مبادا ردِ عمل سے بلبلہ شق نہ ہو جائے۔

اب ڈاکٹروں نے کہا خطرہ نکل گیا تو اماں بیگم نے بھی سوچا کہ زچگی علیگڈھ ہی میں ہو۔ ذرا سا تو سفر ہے۔ گو بھابی جان دِلی چھوڑتے لرزتی تھیں۔ جہاں کے ڈاکٹروں نے انکا اتنا سفر صحیح و سالم کٹوا دیا تھا۔ اب آنکھوں کی سوئیاں ہی تو رہ گئی تھیں۔ دوسرے وہ زمانے کے تیور دیکھ رہی تھیں، اگر اب کے وار خالی گیا تو بھائی جان کو ان کے سینے پر سَوت لاتے میں کوئی بہانہ بھی آڑے نہ رہے گا اب تو وہ نام چلانے والے کی آڑ لے کر سب کچھ کر سکتے تھے۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا اپنا نام زندہ رکھنے اور اُسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی حالانکہ خود ان کا کوئی اونچا نام تھا ہی نہیں۔ دنیا میں۔ مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ بھی نہ پورا کر سکیں تو یقیناً انھیں سکھ کی سیج چھوڑنا پڑے گی۔ یہ چند سال تو جوانی اور حسن کے بل بوتے پر وہ ڈٹی رہیں، پر اب تو ذرا تخت کے پائے ڈگمگاتے

جا رہے تھے اور وہ انھیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اُتر کر بے چاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔ سینا پرونا تو انھوں نے سیکھا اور نہ اس میں جی لگے دو بول پڑھے تھے، سو وہ بھی بھول بھال گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اگر ان کا کوئی کھلانے پلانے والا نہ رہے تو وہ صرف ایک کام اختیار کر سکتی ہیں۔ یعنی وہی خدمت جو وہ بھائی جان کی کرتی تھیں خلقِ خدا کی کریں۔

لہٰذا وہ جی جان سے اس بار ایک ایسا ہتھیار مہیا کرنے پر تلی ہوئی تھیں جس کے سہارے ان کے کھانے پہننے کا انتظام تو ہو جاتا۔ باپ نہ سہی دادا دادی تو پالیں گے ہی۔

زبردست کا ٹھینگا سر پہ۔ اماں بیگم کا نادر شاہی حکم آیا اور ہم لوگ یوں لدے پھندے علی گڑھ چل پڑے۔ نئے تعویذوں اور ٹوٹکوں سے لیس ہو کر بھابی جان میں بھی اتنی ہمت ہو گئی

"الٰہی خیر" بی مغلانی انجن کی ٹکر سے بے خبری میں دھڑام سے گریں اور بھابی جان نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے گھڑا دبوچ لیا۔

"ہے ہے یہ گاڑی ہے کہ بلا چلا الٰہی پیروں کا صدقہ .... اے مشکل کشا" بی مغلانی بھابی جان کا پیٹ تھام کر بُڈ بُڈ کر کے درود اور کلامِ پاک کی آیتیں پڑھنے لگیں۔ خدا خدا کر کے غازی آباد آ گیا۔

طوفان میل کا نام بھی خوب ہے۔ وندناتی چلی جاتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ڈبہ پورا اپنے لئے ریزرو تھا۔ بھیڑ بھاڑ کا خدشہ ہی نہ تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے والی گاڑی میں بھری ہوئی مخلوق کے مطالعے میں محو اور بی

مغلانی انجن کی سیٹی کے خوف سے کان بند کئے بیٹھی تھیں۔ بھابی جان کو تو دور ہی سے بھیڑ کو دیکھ کر چکر آ گیا اور وہ وہیں برتھ پر بیسُر گئیں۔ جوں ہی ریل رکی ڈبہ کا دروازہ کھلا اور ایک گنواری گھسنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھسیٹا، مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیٹ چھپکلی کی طرح لٹک گئی اور بی مغلانی کی "ہیں ہیں" کی پرواہ نہ کر کے اندر رینگ آئی اور غسل خانے کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپنے لگی۔

"اے ہے موئی توبہ ہے" بی مغلانی منمنائیں "اے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے؟"

ہاں بیبی، ہوئی بیدم عورت نے اپنے پپڑیاں جمے ہونٹوں کو بمشکل مسکراہٹ میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اے خدا کی سنوار دیدہ تو دیکھو مردار کا۔۔۔۔ توبہ ہے اللہ توبہ" اور وہ باری باری اپنے گالوں پر تھپیڑ مارنے لگیں۔

عورت نے کچھ جواب نہ دیا صرف درد کی شدت سے تڑپ کر غسل خانے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سانس اوپر بے ترتیب ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹھنڈی مٹی پر اوس کی بوندوں کی طرح پھوٹ آئے۔

"اری کیا پہلوٹھی کا ہے؟" بی مغلانی نے اس کے الھڑپن سے خوفزدہ ہو کر کہا اور اس بار کرب کا ایسا حملہ پڑا کہ وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اسکے چہرے کی ساری رگیں کھنچنے لگیں، لمبے لمبے آنسو اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔ بی مغلانی "ہے ہے" "اوئی" "ہائے" کرتی رہیں اور وہ درد کی لہر کو گھونٹتی

وہی ہیں بسور رہی تھی اور بھابی جان سسکیاں لے رہی تھیں
"اے ہے بی کنواری کیا مزے سے بیٹھی دیکھ رہی ہو۔ اے بیبی اُدھر منہ
کرکے بیٹھو" اور کنواری نے جلدی سے منہ اُدھر کر لیا۔ پھر جوں ہی درد کی لہر سے
تڑپ کر اُس نے آواز نکالی گردن قابو میں نہ رہ سکی، اور بی مغلانی نے صلواتیں
سنانی شروع کیں" اوئی توبہ جیسے ایک بچے کو دنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا
کنوارپن مسخ ہی تو جائے گا۔ بھابی جان دوپٹہ منہ پر لپیٹے بسور رہی تھیں۔ بی
مغلانی ناک پر برقعہ رکھے خی خی تھوک رہی تھیں اور ریل کے فرش کی جان کو
رو رہی تھی۔

ایک دم ایسا معلوم ہوا ساری دنیا سکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ فضا گھٹ کر
ٹیڑھی میڑھی ہو گئی۔ شدتِ احساس سے میری کنپٹیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح
اکڑ گئیں اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں نے سوچا عورت اب مری اور
اب مری کہ ایک دم سے فضا کا تشنج رک گیا۔ بی مغلانی کی ناک کا برقعہ پھسل پڑا
اور بالکل بھابی جان کی سلیم شاہی جوتیوں کے پاس لال لال گوشت کی بوٹی آن
پڑی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی چیخ میرے منہ سے نکلی اور جھک کر اس ننھی سی
کائنات کو دیکھنے لگی جس نے اپنا لمبا چوڑا دہانہ کھول کر ہائے توبہ ڈال دی۔

بی مغلانی نے میری چوٹی پکڑ کر مجھے کونے میں ٹھونس دیا اور اس عورت
پر گالیوں اور ملامتوں کا طومار لے کر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے سیٹ کے کونے سے
آنسوؤں کی چلمن سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت مری نہ تھی بلکہ اس کے سوکھے
ہوئے ہونٹ جنھیں اس نے چبا ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ مسکراہٹ میں پھیل رہے تھے

اس نے ننھے سے سائل کی واویلا سے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ آڑی ہو کر اس نے اسے اٹھا لیا۔ کچھ دیر وہ اپنے ناتجربہ کار ہاتھوں سے اسے صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے اوڑھنی سے دھجی پھاڑ کر نال کو کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ بے کسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑی "کوئی چھری چکو ہے بی بی جی؟"

بی منگلانی گالیاں دیتی رہ گئیں۔ بھابی جان نے بسور کر میرا آنچل کھینچا پر میں نے ناخون کاٹنے کی قینچی اسے پکڑا دی۔

اس کا سن میرے ہی اتنا ہو گا یا شاید سال چھ مہینے بڑی ہو۔ وہ اپنے "الھڑ" ناتجربہ کار ہاتھوں سے ایک بچہ کا نال کاٹ رہی تھی جو اس نے چند منٹ پیشتر جنا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ بھیڑ بکریاں یاد آنے لگیں جو بغیر دائی اور لیڈی ڈاکٹر کی مدد کے گھاس چرتے چرتے پیڑ تلے زچہ خانہ رما لیتی ہیں اور نوزائیدہ کو چاٹ چاٹ کر قصہ ختم کرتی ہیں۔

بزرگ لوگ کنواری لڑکیوں کو بچہ کی پیدائش دیکھنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زیب النساء نے اپنی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ ایسی ہیبت زدہ ہوئی کہ ساری عمر شادی ہی نہ کی۔ شاید زیب النسا کی بہن میری بھابی جان جیسی ہو گی، ورنہ اگر وہ اس فقیرنی کے بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیتی تو میری ہی ہم خیال ہو جاتی کہ سب ڈھونگ رچاتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھابی جان کے لئے ریل پر سوار ہونا یا اترنا۔

اور مجھے تو کچھ ایسی بھیانک قسم کی شرم کی بات بھی نہ معلوم ہوئی۔ اس سے

کہیں زیادہ بیہودہ باتیں بی مغلانی اور اماں ہر وقت مختلف عورتوں کے بارے میں کیا کرتی تھیں جو میرے کچے کانوں میں جاکر بھٹے چنوں کی طرح پھوٹا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر تو وہ پھوہڑپن سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ کبھی کبھی ہنس رہی تھی جیسے اُسے کوئی گدگدا رہا ہو۔ پھر بی مغلانی کے ڈانٹنے پر وہ سہم گئی اور بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر اگلی سیٹ کے نیچے رکھدیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابی جان کی چیخ نکل گئی۔

اتنے میں بی مغلانی بھابی جان کو ٹٹولتی سہلاتی رہیں۔ اس نے باتھ روم سے پانی لاکر ڈبہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ بھابی جان کی زرکار سلیم شاہی دھو پونچھ کر کونے سے لگاکر کھڑی کر دی۔ پھر اس نے پانی اور چیتھڑوں کی مدد سے ڈبہ سے جلد زچگی کے نشانات دور کر ڈالے۔ اتنے ہم تینوں مقدس بی بیاں سیٹوں پر لدی احمقوں کی طرح اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کو چھاتی سے لگاکر باتھ روم کے دروازے کے سہارے ہو بیٹھی جیسے کوئی گھر کا معمولی کام کاج کر کے جی بہلانے فرصت سے بیٹھ جائے اور چنے چباتے چباتے اونگھ گئی۔ خورجہ پر گاڑی کے دھچکے سے وہ چونک پڑی۔ گاڑی رُکتے رُکتے اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پیر تولتی اتر گئی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا "کیوں ری ٹکٹ؟" اور اس نے مسرت سے بے تاب ہوکر جھولی پھیلادی جیسے وہ کہیں سے جھربیری کے بیر چرا کر لائی ہو۔ ٹکٹ چیکر منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اور وہ ہنستی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھیڑ میں گم ہوگئی۔

"خدا کی سنوار ان خانگیوں کی صورت پر۔ یہ حرامی حلالی جنتی پھرتی ہیں موئی جادوگرنیاں" بی مغلانی بڑبڑائیں۔ ریل نے ٹھوکر لی اور چل پڑی۔

بھابی جان کی سسکیاں ایک منظم چیخ میں ابھر آئیں "ہے ہے مولا خیر تو ہے بیگم دلھن!" بی مغلانی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔

اور وہاں خیر غائب تھی!

اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے خزاں برسانے لگے۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

نئی روح دنیا میں قدم رکھتے جھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری بہن بھلا رانی نے جو طلسم ہوش ربا قسم کی زندگی دیکھی تو مارے ہیبت کے حمل گر گیا۔